کنوارے الفاظ کا جزیرہ

افسانے: وحشی سعید

تجزیے

ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور)

میزان پبلشرز

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

(افسانے)

وحشی سعید

تجزیے

ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور)

میزان پبلشرز

ISBN-

Kunware Alfaz Ka Jazeera(Short Stories)

by Vehshi Syed

Analysis by Dr. Jawed Ahmad (Jawed Anwar)

نام کتاب: کنوارے الفاظ کا جزیرہ (افسانے، تجزیے)

افسانہ نگار: وحشی سعید تجزیہ نگار: ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور)

سرورق: عظمٰی اسکرین ضخامت: ۱۳۰۔صفحات

طباعت: میزان سروسز

کمپوزنگ: عظمٰی اسکرین، وارانسی

سن اشاعت: ۲۰۲۴ء

تعداد: ۳۰۰

قیمت: ۳۰۰روپیہ

میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں!
تم میرے قریب ہوتے ہو!!

''ب'' کی نذر

وحشی سعید

ترتیب

مقدمہ

وحشی سعید کے اس افسانوی مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کی پہلی اشاعت ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی۔اس دور کو تجریدی افسانوں کے عروج کا دور بھی کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعیت پر انفرادیت کا احساس اس طور غالب تھا کہ حساس فرد کے داخل اور خارج میں جو انتشار تھا اور جو ہر فرد کے عمومی داخلی اور خارجی مسائل سے منسلک ہو کر سماجی انتشار کی صورت میں نمایاں ہوا تو اس کی بنیاد کی جانب بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد، ظفر وگانوی وغیرہ نے توجہ کی اور کوزے میں ساگر جیسے محاورے کو عملی جامہ پہنایا۔نیر مسعود کا منفرد اسلوب لکھنوی تہذیب و معاشرت، وہاں کے خصوصی مسائل اور ان کے اسباب کی جانب ذہن کو منعطف کر ایک طرح سے خود ان کی فکشن تخلیق کا شناخت نامہ بن گیا۔وحشی سعید کے اسی دور یعنی ۱۹۷۱ء کے شائع شدہ اس مجموعے میں شامل افسانے اس دور کے غالب موضوعات کو منفرد طریقے سے برتنے کے ضمن میں بعض مقامات پر تخیل کی تجسیم کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس کے علاوہ شعور کی رو تکنیک اور محض ایک دو اختتامی سطور کے ساتھ ماضی کو حال کے ساتھ منسلک کر کے مستقبل کے امکاناتی پہلوؤں کی جانب بھی ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وقت اور حالات کے بدلتے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں برتے گئے موضوعات کی اہمیت بھی بڑھتی گئی ہے جو آج کے سماج کی مختلف اہم حقیقتوں کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔

افسانوں کی زمانی تعین قدر میں ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ اپنے مرکزی واقعہ میں یہ ایک ایسا بیانیہ ہوتا ہے جو کسی خاص زمانی واقعہ کی نمائندگی کرتا ہے اور آخری سطور میں اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ حالانکہ تخیلات کی دنیا میں امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے، لیکن اپنے اختتامی الفاظ کی حد تک یہ افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔جیسے پریم چند کا کفن۔لیکن اس کے آگے کے امکان کو تلاش کرتے ہوئے ایک بہترین افسانہ شوکت حیات کا ''مادھو'' ہے جو اس کے آگے کی کڑی محسوس ہوتے ہوئے آج اور مستقبل تک کے حالات کی ترجمانی اور امکانات سے مملو ہے۔وحشی سعید کے افسانے ''منفی کا قاعدہ'' کی اختتامی الفاظ یہ ہیں۔

''نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم.....توڑ دیا.....

بوڑھے نے نوجوان بیٹے کی لاش خود سپرد خاک کی، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے گھر کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس نے دم توڑا تھا.....

وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

''شروع کرتا ہوں، اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

غور کیا جائے تو افسانے کے اختتام کی کئی صورتیں تھیں مثلاً:

ا۔بوڑھے نے نوجوان بیٹے کی لاش خود سپرد خاک کی، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے گھر کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس نے دم توڑا تھا....اس نے حسرت ویاس سے اس کمرے کے درودیوار کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

۲۔وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا: ''تمام فتنہ وفساد کی بنیاد تو ہے''۔اور بندوق کو بھی اپنے بیٹے کے پاس دفن کردیا۔''

بندوق بمعنی وہ آلات جو صرف تباہی پھیلا سکتے ہیں۔جو خود ظلم وجبر کی اور تحفظ دونوں کی بیک وقت علامت ہے۔ظالم اور مظلوم کے دوران تفریق کے اس فتنے کو ہی اگر ختم کر دیا جائے۔یعنی سب کا ذہن ایک دوسرے کی بھلائی اور مساوات کی جانب ہو جائے تو اس کا معنوی وجود خود دفن ہو جائے گا۔اس طرح اسے بھی افسانے کا بہترین اختتام کہا جاسکتا ہے۔

۳۔''نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم.....توڑ دیا.....مغرب کی اذان کی آواز بوڑھے کے کانوں میں گونج رہی تھی جو سورج کے پوری طرح غروب ہونے کی بھی علامت تھی۔اور یہاں اس کا سورج ڈوب چکا تھا۔''

اس قسم کے کئی اور جملے اس افسانے کا بہترین اختتام ہوسکتے تھے، لیکن غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہ تمام ایک ایسے تاریخی واقعے کی ہیت اختیار کر جاتے ہیں جو ہو چکا ہے یعنی

ماضی کا ایک حصہ بھر ہے۔اب اس سے نصیحت حاصل کر کے زندگی کے لئے یا قوم کے لئے یا

ملک کے لئے آئندہ کی منصوبہ بندی یا کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے۔لیکن وحشی سعید نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پر افسانہ ختم کر کے افسانے کو حال اور مستقبل کے امکانات کا آئینہ دار بنا ہے۔غور طلب یہ بھی ہے کہ یہ لفظ محض افسانے کی بہترین تکمیل کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا مستحکم انسلاک وحشی سعید نے مکالمہ نگاری کے فن کو بروئے کار لاتے ہوئے ان الفاظ سے کیا ہے جو بوڑھے کی زبان سے ادا ہوئے ہیں کہ: ''لیکن بیٹا! ابھی تو بہت آگے جانا ہے''

ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ آخری لفظ افسانے کی ابتداء کا اشاریہ ہے۔تو اب تک جو واقعات درج ہوئے ،وہ کیا تھے؟ان کا شمار کس ابتدائی خاکے میں کیا جائے ،کیوں کہ وہ بھی ماضی کا بیانیہ نہیں ہیں بلکہ اس حال کا حصہ ہیں جس کی ابھی ابتدأ ہو رہی ہے۔یہ تذبذب افسانوی تنقیدی عناصر میں مزید نقاط کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔دوسری بات یہ کہ تجریدی یا جدید افسانوں کے پورے سلسلے میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا اختتام اس نوعیت کا ہو۔اس طرح یہ فن وحشی سعید سے ہی شروع ہوتا ہے اور وحشی سعید پر ہی ختم۔

مجموعے میں شامل دوسرے بعض افسانوں کے اختتامی جملے کسی تاریخی ،سماجی ،نفسیاتی واقعے کے بیان کو حال سے منسلک کر کے غم دوراں یا مسائل دوراں اور جدید ذہن کی انتشاری کیفیت کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔جیسے:

''ابھی وحدت کا لفظ ملا.....ورنہ آئینہ کب کا ٹوٹ گیا ہوتا''۔(مٹھی ،اڑان ،آسمان)

''لیکن سوچوں نے ہمیں پھر ''کیا'' کے حوالے کر دیا''۔(آتش بیان)

''وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے،اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔''(خودسری)

''میرا ہم شکل پٹرول پمپ کے پاس میری گاڑی کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا.....پگلے.....تم سے ملنے بھی بہت جلد آ رہا ہوں۔''(سکوت در سکوت)

''کتنے ہی اوراق سیاہ ہوگئے !...اب تو کہانی کا اختتام ہوا۔ انقلاب آتا ہے اور سب کو روند کے چلا جاتا ہے.......لیکن مفکر اب بھی بستی بستی، گاؤں گاؤں شہر شہر اس فرد کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے سر تاج رکھا جائے۔'' (ارتقا کا سانحہ)

''آرٹ گیلری سے تعاقب کرتا ہوا اژدہا اب بھی برابر پھنکارتا جا رہا تھا۔''

(آدھے ادھورے)

''اور جب اس شخص کو شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکایا جائے گا تو شیشے کا چراغ ہمارے ہاتھ میں ہوگا، اور ہم اپنی شخصیت کو ہر لمحے نت نئے روپ عطا کریں گے۔

کیا تم ہمیں پہچان پاؤ گے!!'' (کرچیوں کا سفر)

''آج مجھے ایک کنواں کھودنا ہے۔ میں جانتا ہوں، ساری زمین اندھی ہے۔ مگر مجھے اعتماد ہے وہ کنواں اندھا نہیں ہوگا۔'' (اندھا کنواں)

''میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ میں صندل کا عصا تھما دیا۔ پھر وہ فری جس کو میں منوں مٹی کے نیچے سلا آیا تھا.......میرے کانوں میں آ کر کہنے لگی:

رضو....ذرا بازار سے کچے آم لا!!!!'' (بت پرست)

''زندگی کی جو ساعتیں میں نے سکون کے لئے وقف کی تھیں اب ان ساعتوں میں بھی میں اپنے آپ کو سوچ و فکر کے زنداں میں قید پاتا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں جب جب میری گہری نیند ٹوٹتی ہے، میری مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں ہوتا ہے۔ اور میں اس جزیرے پر ان کنوارے الفاظ کی شناخت کی جستجو میں لگ جاتا ہوں، جو مجھ میں جذب ہو کر بھی مجھ سے بہت دور ہے!'' (کنوارے الفاظ کا جزیرہ)

جدیدت کے عروج کے دور میں بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد، ظفر اوگانوی کی صف میں وحشی سعید کے یہ افسانے اس طور بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں کہ ایک حقیقی تاریخی پس منظر لئے ہوئے یہ بیانئے جن میں خود احتسابی، احساس شکست، تنہائی، وجودیت

وغیرہ موضوعات کے برتنے میں سب سے زیادہ پیچیدگی اور اختصار وحشی سعید کے یہاں ہی

ہے۔اس دور میں ان کی مقبولیت نہ ہونے کا ایک اہم سبب یہ سمجھ آتا ہے کہ رسائل وجرائد میں اشاعت سے دور رہے۔اس لئے کہ وحشی سعید کی اس وقت کی کاروباری مصروفیات نے نشرو اشاعت کے لئے وقت کی وہ یکسوئی فراہم نہ ہونے دی جو اس کے لوازمات کا اہم جزو ہے ،لیکن رات کے لمحوں میں مطالعے اور تخلیق کا سلسلہ جاری رہا جس کا ثبوت ان کی بعد کی فکشن تخلیقات ہیں۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں شامل تمام افسانے اس دور کے ساتھ ہی موجودہ دور کے اہم سماجی ،اقتصادی ،سیاسی ،نفسیاتی موضوعات جو دور حاضر میں لکھے جانے والے افسانوں کی تخلیق کے اہم اسباب ہیں ،ان کی بھی بہترین آئینہ داری کرتے ہیں۔اس لئے کہ فکشن تخلیق میں موجودہ دور کی حقیقتوں کے ادراک کے تبدیل ہو چکے اور ہو رہے لسانی اور ملفوظی زاویوں کے برتنے کے عمل جس طور جاری ہیں ،وحشی سعید کے افسانے ان تمام کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کو فکشن کی جمالیاتی قدروں اور ان تاریخی روایات کا پورا احساس ہے جو معنی خیزی میں اس طور وسعت پیدا کرتے ہیں کہ کوئی بھی زمانی قید بے معانی ہو جاتی ہے۔

وحشی سعید کے ان افسانوں کی تخلیقیت کے جواز تلاش کئے جائیں تو تخیلات کے ضمن میں کچھ واضح اور غیر واضح محرکات مل کر فن پارے کو بعض اوقات ایک نامانوس یا بہت غور و فکر کے بعد سمجھ آنے والے حیرت ناک تجربے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔اس قسم کے بیانیے ثابت کرتے ہیں کہ حقیقت ہمیشہ متحرک اور فعال ہوتی ہے ،اور اس کے مختلف پہلو جہاں وحشی سعید کے افسانوی پہلوؤں کو جمالیاتی سطح پر کئی زاویے سے دیکھنے کا تقاضا کرتے ہیں وہیں باطن میں ایسے کئی حقیقی پہلو رکھتے ہیں جن میں انسانی ذہن کے ہر دور کی بصیرتوں سے منسلک ہو جانے کی قوت ہے۔یہ وہ خصوصیت ہے جو وحشی سعید کی فکشن نگاری کو کسی بھی حدودی تعین سے

دور رکھتی ہے۔ ہر متنی قرأت کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بھی پورے سچ کی دریافت میں کوئی کمی ہے۔ اس طرح ان کی مختلف تاویلوں کے در وار ہتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک ایسی تحیر زا دنیا ہے جو ہر قرأت میں کچھ نئے تاثر سے دو چار کرتی ہے۔ ایک نشست میں کوئی نقطہ گرفت میں آتا ہے تو دوسری قرأت میں وہی نقطہ یا تو مزید وسعت اختیار کر لیتا ہے یا پھر ایسی معنوی جہات سے روشناس کراتا ہے جس کی ہمیں توقع نہیں ہوتی۔ یعنی ہر قاری اپنے فہم و ادراک کے اعتبار سے اپنی اپنی جستجو کا سراغ ان میں پا سکتا ہے۔ اس طرح یہ افسانے Open Ended کی ہیت اختیار کر جاتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو وحشی سعید کے افسانے اپنی لفظی اور معنوی تکمیلیت سے انکار کرتے ہیں۔ دھند در دھند کی تہوں میں بھی روشنی کی ایسی کرنیں پوشیدہ ہیں جو نئے امکانات کی راہیں روشن کرتی ہیں۔ ان نئے امکانات میں صنفی ہیت کے متعلق بحث بھی تب شامل ہو جاتی ہیں جب ہم افسانچے کی شعریات کے تعلق سے وحشی سعید کے بعض افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ افسانچوں کا تصور جو ادھر کچھ برسوں میں تخلیقی وجود پا رہا ہے اس میں اختصار کے علاوہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو اس کی شعریات کو مرتب کرنے میں ہماری مدد کرے۔ افسانچوں کی مروجہ ہیت وحشی سعید کے یہاں ان کے ۶۷ء میں لکھے گئے اور ۷۱ء میں شائع اس افسانوی مجموعے کے بعض افسانوں میں موجود ہے جیسے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''پہچان''، ''خودسری'' اور گمراہی۔

یہ تمام خصوصیات مل کر وحشی سعید کے اس افسانوی مجموعے کو نہ صرف ادبی اعتبار سے بہت اہم بناتی ہیں بلکہ بلراج مین را، سریندر پرکاش اور انور سجاد کے دور کے وہ واحد فکشن نگار ہیں جو اپنے اولین تخلیقی دور سے ہی ماضی، حال اور مستقبل کے موضوعات، لفظی و معنوی فضا کو اپنے فکشن میں بہت کامیابی سے برتتے آرہے ہیں اور نئے نئے فکشن تنقیدی اصولوں کے لئے بھی ان کی تحریریں مشعل راہ کا کام انجام دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور)

کشکول

اب بھی رنگوں میں قوس قزح کی لکیر اپنی تمام رعنائیوں سے ابھرتی ہے۔ وہ، وہ قوس قزح ہے جو ابھر جاتی ہے، کھو جاتی ہے اور میں چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتا ہوں:

''تم قوس قزح ہو!''

وہ اپنی بڑی بڑی، موٹی موٹی آنکھوں سے خاموش رہنے کا حکم دیتی، وہی آنکھیں جن میں درد اور کرب کی پرچھائیں نظر آتی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا۔ اب.....اب میں اپنے آپ کو اضطراب، بے چینی، بے بسی کے عالم میں تڑپتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

وہ کتابی چہرہ اب بھی نظر کے سامنے ہے۔ جس پر دو موٹی موٹی آنکھیں سنجیدگی اور خاموشی کی پرچھائیاں معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی کمر پر بالوں کی لمبی چوٹی، اس کی صحت مند پیٹھ اور اس کے کانوں میں چمکتی اور جھولتی ہوئی بڑی بڑی بالیاں!

دو سال ہو گئے...دو سال پہلے سبیل کے نام شادی کا لیبل لگا کر پتھروں کی دنیا میں آ گئی۔ اس دنیا کا عجیب اور بے ہودہ سا نام بھی تھا۔ پتھروں میں پتھر کی زندگی تھی۔ پتھر کے پھول تھے۔ بے حسن....خوشبو سے عاری، اور نزاکتوں سے بے بہرہ۔ وہاں زندگی کا پھول بھی سوکھ سوکھ کر کانٹا بن جاتا ہے۔

اور یہی قوس قزح کی دنیا تھی!

وہ اپنی خوشبو کھو رہی تھی.....وہ جانتی تھی اور یہی احساس جان لیوا تھا۔ کاش احساس بھی مردہ ہو جاتا۔

ترتیب رکھنے والا سبیل ترتیب کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ کالج کی جوان فضا نے ہماری دوستی پر مضبوط مہر لگائی۔ مگر سبیل میری بے ترتیب زندگی سے ہم آہنگی پیدا نہ کر سکا۔ وہ مکانوں میں رہتا تھا۔ انجینئر بن گیا۔ وہ میری فاقہ مست زندگی کو کوستا تھا۔ اور میں اپنی قسمت

پر ناز کرتا تھا۔ وہ بلو پرنٹ کی لکیروں میں کھو گیا۔ لکیروں کی دنیا لکیروں تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ سبیل کو ان لکیروں کی نوک پلک درست کرنے سے غرض تھی۔ مکان گر جاتے تھے بن جاتے تھے۔ یہ تو زندگی کا کاروبار تھا۔ وہ مکانوں کو کھڑا کرنے والا، انجینئر تھا، ان کی اونچائی اور لمبائی سے واسطہ رکھتا تھا۔

قوس قزح لکیر نہیں تھی.....مکان نہیں تھی.....! وہ کھو گئی....الجھ گئی!!

انسان انسان ہوتے ہیں۔ وہ مکان نہیں ہوتے، ان میں حرارت اور جذبات ہوتے ہیں۔ دل اور خواہشیں ہوتی ہیں۔ ان کے مزاج اینٹ اور پتھر نہیں ہوتے۔ سبیل کی دنیا میں پتھر توڑے جاتے۔ گارے سے سجائے جاتے، اپنی دنیا میں اکیلی اکیلی قوس قزح....اکیلی تھی، سبیل کی زندگی متوازن خط تھی....

اپنی فاقہ مست زندگی نے مجھے خیالوں میں لے لیا۔ میں ادیب بن گیا۔ جو رنگوں کی دنیا میں رہتا۔ رنگوں سے پیار کرتا، رنگوں سے لفظوں کے پیکر تراشتا۔ اور وقت.....وقت انوکھا ہوتا ہے.....وقت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔ سونا بنا دیا.....سونے سے تولا۔ ادب سے اچھے پیسے وصول ہوئے۔ مگر اپنی الجھی دنیا میں پیچ وخم رہے۔

......سلجھانے والا جو نہ ملا۔ مگر میں کب اس الجھی ہوئی دنیا سے خوفزدہ ہوا....گھبرایا یا ڈر گیا....مجھے اپنی وحشت سے پیار تھا، لگاؤ تھا۔

پھر ایک دن اچانک میرے ہاتھ ایک خط لگ گیا۔

یہ اینٹوں اور پتھروں کی دنیا سے آیا تھا، سبیل نے مجھے اس دنیا میں چند دنوں کے لیے آنے کی دعوت دی۔ میں جانتا تھا، وہاں رنگ تھے....اچھے بھی، برے بھی! خوبصورت اور.....بھدے!.....رنگوں کی اس ترتیب میں نیلوفر، زاہدہ اور فریدہ تھیں۔ اور سبیل کو ان رنگوں کو بکھیرنے کے لیے برش چاہیے۔ میں رنگوں سے تصویروں کو ترتیب دیتا۔ پھر ایسے رنگ جو چھوئے نہیں گئے، پرکھے نہیں گئے۔ جن کی نزاکتوں اور دلفریبیوں میں کوئی الجھ نہیں گیا تھا۔ سبیل کی ان تین بہنوں میں مجھے کسی ایک کا دامن تھام لینا تھا....مگر قوس قزح.....وہ قوس تھی.....قزح تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے لاکھوں میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے....قوس قزح کے سامنے ان کی نزاکتیں اور ادائیں ماند پڑ جاتیں۔ اس لیے قوس قزح دل وجگر میں اتر گئی۔ میں

نے چپکے سے اس کے کان میں کہا:

''تم قوس قزح ہو.....!''

وہ خاموش رہی۔ خاموشی اس کا ہتھیار تھا۔ خاموشی ہی اس کا حربہ تھی۔ مگر زندگی خاموش نہیں تھی.....ہل چل تھی..... بھاگ دوڑ تھی۔ جدو جہد تھی۔ مگر وہ کورا کاغذ تھی..... میں نے چاہا..... بہت چاہا..... وہاں لکیریں کھینچ دوں..... اتنی ساری لکیریں کہ وہ گنتے گنتے تھک جائے اور میں لکھتے لکھتے رک جاؤں۔

مگر اس کا کورا جواب سرحد کی یاددہانی کرتا تھا..... ''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔!''

وہ پتھروں کی دنیا میں رہتی، جہاں سمجھ بھی مردہ ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں پتھر لڑتے ہیں، پتھر توڑے جاتے ہیں..... مگر دل..... دل، گوشت کا لوتھڑا ہے.....کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں۔

میں اس سے کہتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ ماضی کی یادمیں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں اچھا ہے اپنے حال کو تعمیر کرو..... مگر پتھروں سے سر توڑے جاتے ہیں۔ جنوں نے کب سنگ دیکھا۔

فرصت کی بات تھی۔ ورنہ فرصت کہاں..... پتھروں کو ترتیب دیتے ہوئے خود بھی سبیل پتھر بن گیا تھا۔ اور جب بھی فرصت پاتا، تو اپنی باتوں کا آغاز اس جملے سے ضرور کر دیتا۔

''تمہاری بھابھی تمہاری بہت تعریف کرتی ہے.....!''

میں صرف ایک رسمی جواب دیتا، الفاظ کی ترتیب نہ بدلتی۔

''میری خوش قسمتی ہے.....!''

وہ مسکرا کے کہہ دیتا......

''پتھروں کی دنیا پسند آئی.....؟''

میں کھو جاتا تھا، الجھ جاتا تھا، زندگی کی رفتار بھول جاتا تھا۔ میں کہہ جاتا.....

''یہاں سب پتھر ہیں!''

وہ زور کا قہقہہ لگاتا..... قوس قزح ان قہقہوں کے بادلوں میں چھپ جایا کرتی..... قوس قزح پتھر کا مجسمہ تھی، اس کی روح کو آزاد کرنا، اس میں حرارت بھرنا، جوانی کا احساس

دلانا، وہاں روح میں جسم کی تپش کی ضرورت تھی.....

ان کے ڈرائنگ روم میں کس پیرمنٹش کے یہ جملے بار بار میری نظروں کے سامنے آتے تھے۔

''ان لوگوں کو پاکیزہ نہیں کہا جا سکتا جو اپنے جسم کو دھو کر پاک و صاف کر لیتے ہیں..... حقیقت میں پاک وہ ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے۔''

زاہدہ، نیلوفر اور فریدہ کے رنگ پھیکے پڑتے رہے۔ زاہدہ شاعر تھی۔ اس لحاظ سے اس کے اور میرے درمیان تعلق قائم ہوا۔ وہ مجھ سے اپنے اشعار کی اصلاح کراتی..... مگر میں اصلاح کی سرحد کو عبور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حالانکہ قوس قزح اکثر کہتی:

''ایک ادیب کی بیوی کو شاعر ہی ہونا چاہیے.....!''

اس کو کچھ دیر خاموش نگاہوں سے تکنے کے بعد میں اپنے ردعمل پر قابو پاتا۔ جیسے کوئی بہت دور کا سفر طے کر کے دم لیتا ہے۔ میں صاف اور واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیتا۔

''یہ قول مجھے پسند نہیں ہے....!''

وہ بھولے پن کو اپنا لیتی، انجان بن جاتی اور کہہ دیتی....

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں!''

میں اس کو اپنا احساس دلانا چاہتا تھا، اپنی راہ بتانا چاہتا تھا۔

''کبھی کبھی میں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر کھلے ہاتھ یاد آجاتے ہیں.... دامن چھڑانے کی کوشش میں اس کی زبان پر سچائی آجاتی......

''ان پتھروں میں تمہارا کوئی کام نہیں۔''

کورے کاغذ پر شکن پڑ جاتی۔

پھر ایک ایسی شام بھی آئی، جو سنسان تھی۔ اس شام میں تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی درخشندہ فضا اور سیاروں کی مسلسل گردش میں فطرت سے دور اپنی نئی کہانی میں کھو گیا۔ اس کہانی نے مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا۔ مگر اس تصور کی دنیا میں زیادہ دیر نہیں بھٹک سکا۔ کسی نے دستک دی.....وہ قوس قزح تھی!

میں نے دبی دبی آواز میں کہا:

''تم ہو قوس!''

''ہاں میں ہوں!'' اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی۔ اس کے آنے سے میرے ذہن میں تاریکی بڑھ گئی۔ جب تک وہ پردہ نہ اٹھاتی روشنی نہیں ہونی تھی..... میں نے مجبوراً کہا:

''کیا بات ہے؟''

اس کے چہرے پر تھکن تھی جیسے وہ لاکھوں میل طے کر کے آئی ہو۔ مگر اس کے چہرے پر اضطراب کی کوئی جھلک نہ تھی۔ اس نے پردرد آواز میں کہا۔

''پتھروں کی دنیا نے مجھے پتھر بنا دیا ہے۔''

میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا۔ اک جنون کی آگ میرے رگ و پے میں لہراتے ہوئے ذہن پر اثر کر گئی۔ میں نے کہا:

''تمہیں احساس ہوا؟''

وہ خاموش رہی۔ خاموشی بڑی کہتے کی تھی۔ وہ کھڑی ہوئی..... کمرے میں ٹہلتی رہی..... دائیں ہاتھ سے وہ اپنی زلفوں کو سنوارتی..... کبھی وہ اپنے ماتھے کے پسینے کے قطرے رومال سے خشک کرتی..... اچانک وہ وحشت زدہ آواز میں بول اٹھی۔

''چلے جاؤ..... پتھروں کی اس دنیا سے چلے جاؤ..... میں پتھر رہنا چاہتی ہوں..... صرف پتھر رہنا چاہتی ہوں.....''

کتنے ہی بت ٹوٹے، کتنے تصورات پاش پاش ہوئے..... میں دوڑا..... میں بھاگا.....

پتھروں کی دنیا سے واپس ضرور آیا لیکن پتھر نہ بن سکا.....

دل کا درد روگ بن گیا!!!

تجزیہ:

وحشی سعید کا افسانہ ''کشکول'' اپنے طرز بیان کی ندرت جن میں الفاظ کے انتخاب کی شعوری کوشش ہے، سے ایک سحر انگیز فضا کی تکمیل کرتا ہے۔ مرکزی واقعہ جسے پلاٹ کہا جاتا ہے، ایک رومانی قصے جسے ناکام محبت کہا جا سکتا ہے، پر مشتمل ہے۔ لیکن مکالمہ، منظر اور حاضر راوی جس قسم کی علامتی گفتگو سے افسانے کو آگے بڑھاتے ہیں، اس کے لئے کس قدر کسب علم کی ضرورت ہو سکتی ہے، اس افسانے میں نمایاں ہے۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ''کشکول'' یعنی دوسروں کی امداد کا محتاج وہ خالی پیالہ جو گداگروں کی شناخت ہوتا ہے۔ علامتی مفہوم میں اگر کسی کی زندگی کشکول کی مانند ہو جائے تو وہ کیسے اپنے دن رات بسر کرتا ہے، اس کی مثال افسانے کا مرکزی کردار جس کا کوئی نام نہیں ہے، اور دوسرے کردار اسے ''تم''، ''آپ'' وغیرہ کہتے ہیں، اپنی معشوق جس سے شاید کبھی کھل کر اظہار محبت نہیں کر پاتا۔ اس کا سبب شاید مفلسی یا کچھ اور ہو سکتا ہے جو افسانے میں واضح نہیں ہے۔ معشوق کو وہ ''قوس قزح'' کہتا ہے۔ وہ شاید اس کی محبت کو سمجھتی بھی ہے لیکن ، اشاروں سے ہی اسے خاموش رہنے کا حکم دیتی جس میں درد اور کرب کی پرچھائیں نظر آتی۔ اس درد اور کرب کا سبب کیا تھا، مصنف یہ نہیں بتاتے۔ کیا وہ مرکزی کردار کے اظہار محبت نہ کر پانے کا دکھ تھا اور نسوانی حیا چونکہ خود اظہار محبت کی پہل نہیں کر سکتی تھی، اس لئے اس کی آنکھیں درد و کرب میں مبتلا تھیں یا اس کا رشتہ کہیں اور طے کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں جو اسے پسند نہ تھا لیکن نسوانی عظمت کی پاسداری سے مجبور تھی۔ اسی کشمکش میں دو سال بعد اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ ''پتھروں کی دنیا'' مراد کسی ایسے ترقی یافتہ ملک کے ترقی یافتہ شہر چلی جاتی ہے جہاں جذبات کی کوئی قدر نہیں ہے۔ نہ ایک دوسرے کے سکھ دکھ کا وہ احساس جو مشرقی روایت کی دین ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ماحول میں ڈھل جانے والا تو اس دنیا میں خوش رہ سکتا ہے جیسے سہیل

جوانجینئر تھا اور اس کی تین بہنیں تھیں جن کی شادی کے لئے وہ کوشاں تھا۔ لیکن قوس قزح اس

دنیا میں نہ ڈھل سکی۔ افسانے کے یہ جملے دیکھئے:

''وہ اپنی خوشبو کھو رہی تھی..... وہ جانتی تھی اور یہی احساس جان لیوا تھا۔ کاش احساس بھی مردہ ہو جاتا۔''

مرکزی کردار کو سہیل کچھ دنوں کے لئے اپنی دنیا میں بلاتا ہے۔ اس کا مقصد اپنی تین بہنوں میں سے کسی ایک کی شادی اس سے کرنے کا ہے۔ ایک انجینئر کا اسے اپنے یہاں بلانا اس جانب بھی اشارہ ہے کہ اس کے مالی حالات ٹھیک ہیں یا اب ٹھیک ہو گئے ہیں، لیکن وہ سہیل کی دعوت قبول کر کے اس کے پاس اس لئے جاتا ہے کہ اس کی بیوی یعنی اپنی محبت کو اس پتھروں کے شہر سے واپس لا سکے اور دونوں ایک ساتھ زندگی گزار سکیں۔ وہ کئی بار قوس سے اشاروں میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن وہ نظر انداز کر دیتی ہے۔ لیکن آخر کار جب اس کی سوچ پر بھی محبت غالب آنے لگتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کے قدم ڈولنے لگتے ہیں تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا۔

''کبھی کبھی میں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر کھلے ہاتھ یاد آجاتے ہیں۔''

وہ کھلے ہاتھ کیا ہیں؟ کیا وہ اجداد کی ناموس کے فریادی ہاتھ ہیں جو اسے حد سے باہر نہیں جانے دیتے۔ یہ تصور افسانے کی معنوی وسعت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

انجام کار ضمیر کی آواز اور نسوانی عظمت اسے ''وہ'' سے صاف کہلوا دیتی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، میں پتھر ہوں اور پتھر رہنا چاہتی ہوں۔ ''وہ'' لوٹ آتا ہے لیکن پتھر نہیں بن پاتا اور اس درد کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

افسانے کا سب سے مضبوط پہلو اس کی علامتی مکالمہ نگاری اور حاضر راوی کا بیانیہ ہے جو قاری کو اول تا آخر اپنی گرفت میں لئے رہتا ہے۔ افسانے میں واقعہ در واقعہ کا جو سلسلہ ہے، وہ دوسرے مزید واقعاتی سلسلوں کی جانب ذہن کو متوجہ کرتے ہیں جو بہت اہم ہیں۔ جیسے قوس اتنے دن تک کیوں کشمکش میں مبتلا رہی۔ اتنے دنوں بعد اس نے یہ فیصلہ کیوں لیا، پہلے کیوں نہیں؟ یہ سوال ذہن میں آتا ہے تو قوس جو ایک فرمانبردار بیوی ہے اور تین کنواری نندوں کی بھابھی ہے، ایک بھابھی کے فرض کو کبھی نظر انداز نہیں کرتی۔ مختلف طریقوں سے وہ مرکزی

کردار کے سامنے اپنی نندوں کی خوبیاں بیان کرتی ہے۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاید مافی الضمیر میں کہیں نہ کہیں یہ احساس بھی وجود رکھتا ہے کہ "وہ" کی اس بے سمت زندگی کی کچھ نہ کچھ ذمہ دار وہ بھی ہے۔اگر وہ اظہار نہیں کرسکتا تھا تو یہ تو اس کے اشارے کو سمجھ چکی تھی۔یہی کوئی نہ کوئی سبیل نکالتی تو نہ خوداذیت جھیلتی نہ وہ۔لیکن اب چونکہ وقت پیچھے نہیں جاسکتا لہذا یہ سبیل بہتر تھی کہ ایک نیا رشتہ بھی قائم ہوجاتا اور ایک دوسرے کے سکھ دکھ سے بھی شناسائی ہوجاتی۔

اس طرح حاضر راوی کا بیانیہ اور مکالمہ کے لئے منتخب الفاظ ایک ایسی سحر انگیز فضا پیدا کرتے ہیں جو اس افسانے کو بڑی اہمیت کا حامل بنادیتے ہیں۔

آب حیات

نواب غیاث الدین بیگ کے پاس دولت کے انبار تو نہ تھے لیکن اب تک ان کے پاس ایک قدیم خاندانی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے کچھ نایاب نسخے موجود تھے۔ اب وہ کسی قدر بوڑھے ہو گئے تھے اور ضعیف بھی۔ ان کا اکثر وقت لائبریری ہی میں گذر جاتا۔ اب وہ قدیم نایاب نسخوں میں ہمیشہ کچھ پانے کی جستجو میں لگے رہتے۔ نواب صاحب کے دو ہی دوست تھے۔ ایک میر علی، جو ادھیڑ عمر کے خاندانی دولت مند تھے اور دولت خرچ کرنا بھی جانتے تھے۔ ان کا دوسرا دوست ایک نوجوان تھا۔ کتابوں کے مطالعہ کے شوق نے اس کو نواب غیاث الدین کے قریب کر دیا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے، نواب غیاث الدین بیگ بڑے جوشیلے انداز میں لائبریری کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈگ بھرتے رہے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔ نوکر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید ان کی مجنونانہ حرکت اپنی مرحوم بیوی کی یاد اور اس سے پیدا کردہ اضطراب کا نتیجہ ہے۔

لیکن وہ اپنے دوستوں کا انتظار کر رہے تھے۔ حیات جاوداں پانے کے لیے ایک قدیم نسخہ ان کے ہاتھ آیا تھا۔ جب دوست آئے تو ان کے اضطراب میں کسی قدر کمی ہوئی۔

وہ تینوں نسخے کے بارے میں بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔ تینوں کے دلوں میں حیات جاوداں کے لیے امنگ پورے عروج پر پہنچ گئی۔ اب تک وہ تینوں یہ سمجھتے آئے تھے کہ حیات جاوداں کی اصطلاح صرف قصے اور کہانیوں کی خاطر اختراع کی گئی ہے، لیکن آج ان کو معلوم ہوا کہ اس مفروضے کے پیچھے حقیقت بھی موجود ہے۔

ان تینوں کے درمیان طے پایا کہ حیات جاوداں پانے کے لیے وہ مہم اختیار کریں جس کی نشاندہی قدیم نسخے میں کی گئی تھی۔ مہم کا آغاز سمندر کے راستے سے ہونا تھا۔ اس لیے فوراً

ہی ایک سمندری جہاز کا جو جدید سائنسی آلات سے لیس تھا، انتظام کیا گیا۔ اس کے تمام خرچ کو میر علی نے برداشت کیا۔ چونکہ مہم تھی حیات جاوداں پانے کی، اس لیے اس سلسلہ میں رازداری سے کام لینا بہت ضروری تھا۔ لہٰذا کوئی جہازی عملہ ساتھ نہیں لیا گیا۔ اور وہ تینوں نہایت خاموشی سے ساحل چھوڑ کر سمندر کی وسعتوں میں چلے گئے۔

قدیم نسخہ کے مطابق مہم کی پہلی منزل سمندر میں وہ جزیرہ تھا جو ہمیشہ لہروں میں ڈوبا رہتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک سمندری پانی کے بدلتے ہوئے رنگوں میں جزیرہ ان کی نظروں سے چھپا رہا۔ ان کے اردگرد مایوسی کے جال بچھنے لگے۔ شاید اسی لیے نواب غیاث الدین بیگ نے ایک دن کہا۔

''وہ نسخہ جھوٹا ہوگا، چلو واپس لوٹیں۔''

لیکن نسخے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے قدرت نے ان کے جہاز کا رخ ادھر کر دیا جہاں لہروں میں ڈوبا ہوا جزیرہ تھا۔ احمد تو چیخ ہی پڑا۔

''جزیرہ مل گیا...... جزیرہ!''

وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے!

ان تینوں نے ایک ساتھ لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرے پر قدم رکھا۔ سرزمین پتھریلی تھی۔ یوں تو لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرہ پر چھن چھن کر دھوپ کی کرنیں آرہی تھیں۔ دھوپ کی حرارت سے پتھریلی زمین گرم تھی۔ وہ تینوں ننگے پاؤں گرم پتھروں کے راستے طے کرتے رہے۔ مکمل سکوت میں ڈوبے ہوئے اس جزیرے میں کسی پرندے کی چہچہاہٹ کی آواز تھی نہ کسی حیوان کا نام ونشاں۔ اور انسان کا تو سوال ہی کیا۔ ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے، لیکن چلتے رہے۔ وہ سب مسکراتے ہوئے ایسے چلتے تھے جیسے پھولوں کے راستے پر ان کا استقبال حوریں گلپاشی سے کر رہی ہوں۔ منزل کی سختیاں انجام کی راحت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں!

وہ چلتے رہے اور چلتے رہے۔

قدیم نسخے کے مطابق ''حیات جاوداں'' پانے کی دوسری منزل غار کا دہانہ تھا، لیکن اب تک انہیں کوئی غار نظر نہیں آیا تھا۔ احمد نے ان کو ایک ٹیلے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس

نے کھانا تقسیم کیا۔ وہ کھاتے رہے۔ اور مستقبل کے سنہرے جھولے میں جھولتے رہے۔

کھانے کے بعد.... سفر پھر شروع ہوا۔ سورج ڈوب گیا۔ اندھیرے نے جزیرے کو اپنے دامن میں چھپالیا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن ''حیات جاوداں'' پانے کی کشش ہر مشکل پر قابو پاتی رہی۔ وہ انتہائی خاموشی سے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ اپنے سفر کی دوسری منزل کی ناکامی کا رونا روتے رہے۔ کسی نے ان کے کانوں میں کہا:

''جاؤ، سامنے وہ سرخ پتھر ہے اس کو ہٹا دو۔''

تینوں ایک ساتھ دوڑ پڑے اور اپنی تمام طاقت جمع کر کے سرخ پتھر کو ہٹانے لگے۔ ان کے بازو فولادی بن گئے۔ جانے ان میں قوت کہاں سے آئی تھی۔

احمد سب سے پہلے غار میں داخل ہوا۔ وہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس کی چھت سے پانی کے قطرے ایسے گرتے تھے جیسے آسمان سے ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مہم کی دوسری منزل پر چلتے رہے، آگے بڑھتے رہے۔ سفر کے دوسرے حصے میں ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اور وہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ ہیبت اور سکوت بھرے اس ماحول میں ''حیات جاوداں'' کا خیال اب بھی ایک دل فریب حسینہ کی طرح ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

نہ جانے کتنے دنوں تک وہ چلتے رہے۔ وقت کا حساب اور احساس کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی شدت اختیار کر لیتا کہ کیوں نہ واپس لوٹ چلیں۔ لیکن اب یہ بھی آسان نہ تھا!

اچانک غار میں بجلی چمکی۔ لمحے بھر کی یہ روشنی بھی جیسے سوال بن گئی۔ آخر تم لوگوں کو ''حیات جاوداں'' کیوں چاہیے، نواب غیاث الدین بیگ سوچتا رہا۔ اس کے پاس رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تو نہیں لیکن وہ بھیک منگا بھی نہیں۔ اب بھی مشتری بائی کے لطیف گانوں سے محظوظ ہوتا ہے اور اس کی شوخیوں میں راتیں بتائی جاتی ہیں۔ پھر ایسی عیش پسند زندگی سے فرار کیوں؟ اور ایسے غار میں ''حیات جاوداں'' کی تلاش میں مارا مارا پھرنا کیوں؟''

''زندگی کے حسین پہلوؤں کو اور بھی حسین بنایا جا سکتا ہے۔ جبکہ زندگی امر ہو۔''

اس خیال نے اسے پھر مطمئن کر دیا۔

میر علی کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اور دولت سے وہ زندگی کی کون سی چیز خرید نہیں سکتا تھا لیکن ''حیات جاوداں'' کا کوئی مول نہیں۔ اگر یہ پانے کا موقع اسے ملے تو کترانا کیوں؟

احمد جوان تھا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف، لیکن مہم پسند نوجوان۔ اس نے سوچا اگر ''حیات جاوداں'' ملی تو اچھا، نہیں ملی تو کیا ہوا، ایک مہم سے تو لطف اندوز ہوں گے۔

بجلی کی چمک نے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔ اچانک میر علی نے بلند آواز میں کہا:

''مل گیا، مل گیا، دروازہ مل گیا!

تینوں خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ رقص کرنے لگے۔ مسرت سے بھرے رقص اور بے ہنگم آوازوں نے غار کے سکوت کو درہم برہم کر دیا۔ وہ ناچتے ناچتے بے سدھ ہو کر دروازے کے پاس گر گئے۔ سونے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ خوشبو میں ڈوبی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا ان کے نتھنوں میں گھس کر ان کے جسموں کو سیراب کرنے لگا۔ تینوں میں قوت واپس آ گئی۔ وہ کھڑے ہو گئے اور دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔

سفر کا تیسرا حصہ بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ثابت ہوا۔ وہاں وہ سب کچھ موجود تھا، جس کا ذکر قدیم نسخے میں کیا گیا تھا۔ سرسبز باغ بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان تینوں کی نظریں باغ کی آخری حدود پانے میں ناکام ہوئیں۔ وہاں آبشار تھے، خوش رنگ پرندے تھے، جن کی چہچہاہٹ ایک لطیف کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ سارا ماحول ایک رومانی تاثر سے پر تھا۔ حوروں کی قطاریں ان تینوں کے اردگرد کھڑی ہو گئیں۔ ان پر رنگ برنگ پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پا رہے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے کانوں کے پاس نہایت ہی شیریں اور دھیمی آواز میں کوئی کہہ رہا ہے:

''خوش آمدید..... خوش آمدید۔ ''آب حیات'' تلاش کرنے والوں خوش آمدید!!''

تینوں حوروں کی قطاریں توڑتے ہوئے اس جانب دوڑنے لگے جہاں زمرد کے تالاب میں ''آب حیات'' ہچکولے کھا رہا تھا۔ تینوں آب حیات کے تالاب سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو اپنا سر بلند کر کے چلنے لگے۔ اب ان کے پاس حیات جاوداں تھی۔ ہمیشہ کے لیے وہ..... لافانی انسان بن گئے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ موت اب ان کے لیے ایک خواب ہے۔ جس طرح کل ان کے لیے حیات جاوداں پانا ایک خواب تھا۔ وہ اب کامیاب وکامران اپنی دنیا میں واپس لوٹ رہے ہیں!!

ایک سفید پرندہ اڑتا ہوا آیا اور کچھ اخبار ان تینوں کے سامنے پھینک گیا۔ تینوں نے اخباروں کو اٹھالیا۔ اخباروں کے سرورق پر مغل سرائے کے نزدیک ایک بھیانک ٹرین حادثہ کی خبر چھپی تھی۔ اور مرنے والوں کی فہرست میں ان تینوں کے نام بھی تھے۔ خبر پڑھ کر تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے!!

تجزیہ:

''آب حیات''میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے،اس کا علامتی پہلو بہت معنی خیز ہے۔ابتداء سے کچھ آگے تک تو یہ افسانوی حقیقت لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے لیکن کب یہ تصورات کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے، اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔یہی اس افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت کہی جاسکتی ہے۔اگر پیغام کی بات کی جائے تو زندگی جینے،خوشحال رہنے اور جو خود کے پاس ہے،اسی پر تشکر بجالانے کا پیغام بھی افسانے میں شامل کرداروں کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔لیکن جہد مسلسل کی ذہنیت اور ایک عظیم مقصد کی حصولیابی کا عزم راسخ جس کے بعد صرف فائدے کے علاوہ نصان کا کوئی خدشہ نہیں،افسانے کو آگے بڑھاتا ہے۔

افسانے کے تینوں کردار نواب غیاث الدین جو کسی قدر بوڑھے ہیں، بہت امیر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک قدیم خاندانی لائبریری کے مالک ہیں ۔جو اشاریہ ہے کہ کئی زمانوں سے ان کا خاندان تعلیم یافتہ ہے اور کبھی بہت دولت وثروت والا بھی رہا ہوگا کیوں کہ اس کے بغیر تو لائبریری میں نایاب نسخوں اور اس کے رکھ رکھاؤ کا تصور بھی محال ہے۔اور اب بھی ان کی زندگی کا آرام سے گزرنا علامت ہے کہ ابھی بھی بہت کچھ باقی ہے۔

دوسرا کردار میر علی جو ادھیڑ عمر کے خاندانی دولت مند ہیں اور دولت خرچ کرنا بھی جانتے ہیں،عمر میں تقریباً برابر ہیں۔تیسرا کردار احمد جو نوجوان ہے اور مطالعہ کے شوق نے اسے شاید پہلے نواب غیاث الدین کا دوست بنایا ہوگا اور ان کے توسط سے میر علی کا بھی۔یعنی غور کیا جائے تو ان تینوں کی دوستی اور آپسی انسلاک کا ایک بڑا سبب اور بنیاد علم سے شغف ہے۔میر علی اور نواب غیاث الدین میں دوستی کی بنیاد کیا تھی،افسانے میں یہ انکشاف تو نہیں ملتا ،غالباً دولت مندوں کے آپسی مراسم اس کی بنیاد ہو سکتے ہیں لیکن ایک خاندانی لائبریری کے مالک اور ایک علم کے جویا نوجوان سے ان کی دوستی یہ اشارہ بھی دیتی ہے کہ انہیں بھی کسی نہ کسی طور علم سے انسیت اور اس کی قدر ضرور تھی جو انہوں نے ایک قدیم کتاب سے برآمد ''آب حیات'' پانے کے قدیم نسخے پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی حصولیابی میں ہونے والے کثیر

اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری اپنے سرلی۔ غائب راوی کے صیغے میں یہاں تک کا بیان حقیقی افسانوی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے آگے سمندری جہاز کا انتظام وغیرہ کے مشورے تک کا قیاس حقیقی افسانے کی سرحد میں داخل ہو سکتا ہے۔ استعجابی کیفیت کے عناصر اس کے بعد افسانے کا خاص جزو بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ خواہ ''آب حیات'' کی تلاش کا سفر کسی ایک کردار کے خواب میں ہو رہا ہے یا پھر حقیقت میں۔ لیکن رونما ہونے والے واقعات اور حادثات جہاں زندگی کے کئی سبق دیتے ہیں، وہیں اپنی موجودہ حال پر تشکر بجالانے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ احمد جس کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے، ان مہم جو نوجوانوں کا استعارہ بن جاتا ہے جن کے پاس زندگی میں کچھ کرنے کے لئے بہت وقت ہے، اس لئے اس کے خیالات مختلف ہیں۔

''اچانک غار میں بجلی چمکی۔ لمحے بھر کی یہ روشنی بھی جیسے سوال بن گئی۔ آخر تم لوگوں کو ''حیات جاوداں'' کیوں چاہیے، نواب غیاث الدین بیگ سوچتا رہا۔ اس کے پاس رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تو نہیں لیکن وہ بھیک منگا بھی نہیں۔ اب بھی مشتری بائی کے لطیف گانوں سے محظوظ ہوتا ہے اور اس کی شوخیوں میں راتیں بتائی جاتی ہیں۔ پھر ایسی عیش پسند زندگی سے فرار کیوں؟ اور ایسے غار میں ''حیات جاوداں'' کی تلاش میں مارا مارا پھرنا کیوں؟''

''زندگی کے حسین پہلوؤں کو اور بھی حسین بنایا جا سکتا ہے۔ جبکہ زندگی امر ہو۔''

اس خیال نے اسے پھر مطمئن کر دیا۔

میر علی کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اور دولت سے وہ زندگی کی کون سی چیز خرید نہیں سکتا تھا لیکن ''حیات جاوداں'' کا کوئی مول نہیں۔ اگر یہ پانے کا موقع اسے ملے تو کترانا کیوں؟

احمد جوان تھا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف، لیکن مہم پسند نوجوان۔ اس نے سوچا اگر ''حیات جاوداں'' ملی تو اچھا، نہیں ملی تو کیا ہوا، ایک مہم سے تو لطف اندوز ہوں گے۔''

یہ استعجابی کیفیت افسانے میں آخر تک برقرار رہتی ہے۔ وحشی سعید نے افسانے کا اختتام اس مقام پر کیا ہے کہ خواب اور حقیقت کی کوئی واضح تصویر نہیں ابھرتا۔ قارئین اپنے اپنے نقطۂ نظر سے جو چاہیں جس نہج سے چاہیں، نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

مٹھی، اڑان، آسمان

مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر یہ حقیقت کب آشکار ہوگئی۔ کہ میری شبیہ آئینے میں نظر نہیں آرہی ہے۔ ایسے اوقات زندگی کا حوصلہ توڑنے والے تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن ہماری گرفت کب اور کہاں تک رہ سکتی ہے ہم پر؟...... میں پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل گیا کہ شناخت نے اپنے معنی بدل ڈالے۔ میں شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سب سے اونچے طبقے کے اندر جھانکنے لگا۔ میرا بچہ مجھے دیکھ کر اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا.....

''ممی.....ممی.....ڈیڈی بھوت بن گئے۔''

یہ پہچان پر پہلی کاری ضرب تھی۔ لیکن یہ احساس بہرحال اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت اختیار کرنے لگا کہ میں اپنے تصور سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔ قد کے اونچے ہونے پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی بصارت مجھ سے چھین لی گئی.... کب اور کیسے فہم کی لو ہے جیسی دیوار ٹوٹ گئی اس کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہوا۔ میرے پاؤں کے نیچے آئی ہوئی بھکارن چیخی تو ضرور ہوگی۔ لیکن اتنے اونچے قد پر سماعت کیسے ہوگی۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ جب بھونچال آتا ہے تو کتنی ہی قد آور چوٹیاں اپنے سر خم کر دیتی ہیں۔ وہ بھی ایک بھونچال تھا۔ جس نے میری چھین لی گئی سماعت مجھے واپس کی۔

''کمینہ!.... پاجی!!.....ذلیل!!!''

وہ میرے بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملاتی رہی۔ بھکارن کا نحیف مریل جسم جنون کا مرکزی کردار بنا۔ یہ کہاں کی بہادری تھی کہ اژدہام کے سامنے میں سینہ تان کر کھڑا ہوتا۔ تاریخ نے ایسے کرداروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا، کیا وہ ڈھکی چھپی بات ہے؟ کتنے ہی کٹے ہوئے جسموں کو سونے کے تمغے عطا کیے گئے۔ لیکن وہ تو حالات نے لافانی بنائے یا شوق نے۔ اس لیے میں نے ایک وسیع سرسبز میدان میں اپنے لیے ایک پناہ گاہ

بنائی۔لیکن میدان میں دروازہ کیسا.....؟

پھر بھی میں نے دروازہ بند کیا اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا۔ جلاد کی تیغ جب چلتی ہے تو کس کو معلوم ہے کہ کہاں جا کر لگے گی۔ میدان تو میدان ہے۔ کب تک میں محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ تھوکتے رہے، اور میں اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ پھر جب وہ تھک گئے اور میری معصومیت پر مر مٹنے کے لیے راضی ہو گئے تو میں سمجھا کہ میرا سب کچھ ڈھل گیا۔

میں اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ جیسے شیر کچھار سے۔ لیکن معصومیت میں جادوگری کی روح حلول ہو گئی۔ شعبدہ بازی اب تو میرے لیے گھر کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ میری ہر حرکت کو کسی کی تباہی یا فلاح پر تعبیر کرنے لگی۔ اور اب جب میں مہاتما سمجھا گیا تو ہمارے لیے خانقاہوں کی بنیادیں ڈالی جانے لگیں۔

کچھ بھرم تو رکھنا ہی ہوگا۔ میں مریدوں کو کب تک مایوس کرنے والا تھا۔ میرا قد جو پہلے ہی اونچا تھا اور اونچا ہوتا گیا۔ یہ اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے پرستاروں کو اپنے زریں اقوال سے آشنا کروں۔ ان میں سے بہت سے اقوال بہت ہی پرانے تھے، لیکن ہر پرانی چیز کا نشہ دو آتشہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا:

''آپ اپنے آپ کو پرکھنا چاہتے ہو تو اپنے ہی جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرو۔ بیٹھے بٹھائے بہروپ سے نجات کون چاہتا ہے۔

نقصان پر فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے۔ پھر نہ جانے کہاں سے انا آئی۔ پہلے مجھے گلے لگایا۔ میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ پھر جاتے جاتے ناگ اپنے گلے سے اتار کے میری گردن میں پہنا دیا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اس سے کہوں، کیوں بھئی؟ اس بوجھ سے میری گردن تھک جائے گی.....

لیکن.....میری زبان نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اس ناگ نے مجھے اپنی گرفت میں اس سختی سے لیا جیسے کسی نے مجھے ارغوانی شراب میں نہلا دیا ہو۔ بے ہوشی کی اس کیفیت سے فرار کا صرف ایک راستہ تھا کہ ناگ سے چھٹکارا حاصل کروں۔ لیکن ناگ مجھ سے زیادہ ہوشیار تھا۔ میں راستوں کا انتخاب کرتا رہا اور وہ اپنے اوپر میرا خون ملتا رہا۔

پھر نہ جانے مجھ میں جہد کا جذبہ کیسے اور کیوں کر آندھی کی تیزی اختیار کر گیا کہ میں

نے ناگ سے اپنی گردن آزاد کرانے کے لیے اپنے فولادی ہاتھوں میں اس کا جسم لیا۔ لیکن اس نے اپنے جسم کی مضبوطی سے کام لیتے ہوئے میری گردن دبوچنی شروع کی۔ مجھے اپنی سانس رکتے ہوئے محسوس ہونے لگی۔ میرے ہاتھوں سے طاقت چھین لی گئی۔ میں ہار گیا لیکن میرا ہاتھ کھل گیا..... یا.....

میری مٹھی کھل گئی..... اب تو اڑان تھی، اڑان کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ خلا میں اڑنے والے آسمان کو اپنی سمت بناتے ہیں۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ آئینہ بھی جھوٹا ہے۔ آئینہ کب کسی کو پہچان پایا کہ اب مجھے پہچان پاتا۔

ابھی وحدت کا لفظ ملا..... ورنہ آئینہ کب کا ٹوٹ گیا ہوتا۔

تجزیہ:

''مٹھی، اڑان، آسمان'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس افسانے کا دارو مدار ابہامی عناصر پر ہے۔ یہ وحشی سعید کا کمال ہے کہ موضوع کے اعتبار سے علامتی پیرایۂ اظہار پورے افسانے میں موجود ہے۔ عنوان پر ہی غور کیا جائے تو ''مٹھی'' بمعنی بند یعنی قید کی علامت ہے جس کے اندر جو کچھ بھی ہے، آزادی سے محروم ہے۔ یہ مٹھی ہوس پرستی کی ہو، مفاد پرستی کی ہو یا پھر دوسروں کے دکھ درد کا احساس نہ ہونے کی ہو، اس میں قید انسان ہر حال میں اخلاقی، اقداری اور سچائی کی اڑان سے محروم رہتا ہے اور اس طرح وہ اس وحدت کی محبت تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا جو ساری کائنات کا مالک ہے اور جس کے سراغ میں اخلاق، اقدار، سچائی اور انسانیت کے جذبات کے آسمان میں پرواز ضروری ہے۔

اس افسانے کا کردار ''میں'' ایک ایسے شخص کی علامت ہے جو انسانیت اور اخلاقیات سے دور صرف اپنے مفاد کے لئے زندگی بسر کرتا محسوس ہوتا ہے۔ رشوت خوری یا دوسرے طریقے کے غلط دھندوں سے کمائی دولت کے ذریعہ وہ سب سے اونچے بمعنی امیر ترین طبقے میں شمار تو ہونے لگتا ہے لیکن جس طرح انسانیت جسم کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی مسرتوں کا بھی پیش خیمہ ہوتی ہے، اسی طرح ناجائز کاموں، ظلم، اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسروں کی حق تلفی اور اس سبب ان کے دل سے نکلتی ہوئی آہیں بھی اپنے اثرات جسم اور روح پر ظاہر کرتی ہیں، جب بظاہر چہرے سے رونق ختم ہونے اور ایک قسم کی نحوست ٹپکنے کا احساس، بدن کا بیڈول پھیلاؤ اور روحانی اضطراب، یہ تمام مل کر ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں جو خود انسان کے شناخت نامے سے تبدیل ہو کر کسی حیوان، درندے کا شناخت نامہ محسوس ہوتی ہے۔

''مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر یہ حقیقت کب آشکار ہوگئی۔ کہ میری شبیہ آئینے میں نظر نہیں آرہی ہے۔ ایسے اوقات زندگی کا حوصلہ توڑنے والے تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن ہماری گرفت کب اور کہاں تک رہ سکتی ہے ہم پر؟......میں پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل گیا کہ شناخت نے اپنے معنی بدل ڈالے۔ میں شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سب سے اونچے طبقے کے

اندر جھانکنے لگا۔ میرا بچہ مجھے دیکھ کر اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا.....

''ممی.....ممی.....ڈیڈی بھوت بن گئے۔''

بچے کا یہ کہنا کہ ''ممی...ممی....ڈیڈی بھوت بن گئے'' اپنوں کے اندر سے اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف پہلا احتجاج ہے جو یہ بھی باور کراتا ہے کہ باہر کے لوگوں پر کس قدر اپنی طاقت بھر ظلم توڑے گئے، ان کی حق تلفی کی گئی، بے انصافی کی گئی کہ ان کی آہیں اور فریادیں گھر کے اندر ایک چھوٹے بچے کی زبان بن گئیں۔ جن پر غور کرنا اب ضروری ہو گیا تھا۔ یہ مسلم حقیقت ہے کہ آدمی اچھا برا جیسا بھی عمل کرتا ہے، اس کی شناخت ویسے ہی بنتی چلی جاتی ہے خواہ اس کو کوئی بتائے یا نہ بتائے۔ لیکن ایک انتہا کے بعد جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو اس راستے پر اتنا آگے نکل چکا ہوتا ہے کہ واپسی بھی خود کی ذات سے جہاد کے مترادف ہوتی ہے۔ پاؤں کے نیچے آئی ہوئی بھکارن کسی مظلوم کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے الفاظ ''کمینہ... پاجی.... ذلیل !!!'' ایسے کرب آمیز فریاد یہ الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو تقریباً تمام مظلومین اور شریف النفس افراد کی آہ و فریاد اور لعنت ملامت کو ایک اژدہام میں بدل کر اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔

یہ الفاظ جو اس کی ذہن اور دل میں اندر تک سرایت کر کے جب اس کی وقت اور حالات کے ہاتھوں چھینی ہوئی اس کی سماعت بمعنی انسانیت کو واپس لے آتے ہیں تو وہ اپنے لئے صداقت کی جائے پناہ جو سر سبز اور شاداب وسیع میدان کی طرح ہے، کا انتخاب محفوظ ہونے کے لئے کرتا ہے۔ لوگوں کا اس کے اوپر تھوکنا یہاں ان پریشانیوں اور اذیتوں کا استعارہ بن جاتا ہے جو اس راہ میں لازمی ہے۔ لیکن ان سب کو برداشت کرتے ہوئے حالات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے جب وہ صداقت کی منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو مہاتما سمجھا جانے لگتا ہے۔

اس کی اس تبدیلی کو تقلید کے طور پر اپنانے کی خواہش رکھنے والے اس سے صداقت کی منزل کی راہ دریافت کرنا چاہتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔

''آپ اپنے آپ کو پرکھنا چاہتے ہو تو اپنے ہی جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرو۔ بیٹھے بٹھائے بہروپ سے نجات کون چاہتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ جن اذیتوں سے ''وہ'' اپنے ضمیر اور روح کی اضطرابی کی مجبوری سے دو

چار ہوا تھا اور انہیں سر کیا تھا، عیاری مکاری کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کرنے والے صرف
جذباتی سطح پر کوری تقلید کی خواہش میں ایسی قربانیاں کہاں دینے والے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت
ہے کہ اذیتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر لینے سے آگے بھی دشوار مراحل ہیں۔

''نقصان پر فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے۔ پھر نہ جانے کہاں سے انا آئی۔ پہلے مجھے گلے لگایا
۔میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ پھر جاتے جاتے ناگ اپنے گلے سے
اتار کر میری گردن میں پہنا دیا۔''

صداقت کی ایک منزل تک رسائی کے بعد جبکہ دنیاوی مکر وفریب کے نقصان کے
سامنے قلبی و روحانی تسکین فائدے مند محسوس ہوتی ہے، زندگی کے چلتے رہنے میں ایک منزل یا
پہلی منزل پر بھی رکا نہیں جا سکتا۔ منزلیں راستوں کی صورت اختیار کر کے نئی منزلوں اور انہیں
سر کرنے کے نئے اصولوں کا پتہ بھی دیتی ہیں، جن میں ایک دشوار تر اصول ''انا'' نامی ہے جو
کب فطرت میں شامل ہو جاتا ہے، اس کا احساس نہیں ہوتا۔ احساس تب ہوتا ہے جب یہ
اصول شخصیت کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

''وہ'' کی زندگی میں ایسے کئی مراحل آئے جب اس نے ''انا'' کے اصول سے
چھٹکارا پانا چاہا لیکن اس کے ''ناگ'' جواب تک کی صداقت کی منزل پر قائم رہنے کا ثمرہ تھا، وہ
ان مراحل سے زیادہ طاقتور ہوتا گیا اور انہیں سر کرتا گیا۔ آخر کار اس نے اپنے ارتقائی نہج میں
''وہ'' کی ''مٹھی'' کھول دی۔ اب وہ وحدت کے ان نظاروں کی سیر کر رہا تھا جو آسمان کی طرح
لامحدود تھے۔ اس طرح وحدت کے لفظ نے آئینے سے ابھرتے ہوئے اس کے عکس کو بھی تبدیل
کر دیا تھا جو کہ پہلے اس کا شناخت نامہ تھا۔

آسمانی صحائف یا انسانیت کے فلسفے کے نقطۂ نظر سے وحشی سعید نے آج کی عیش
پرست زندگی کے لئے ایمان اور ضمیر کا سودا کرنے والے، ظلم اور ناانصافی میں غرق حاضر راوی
جو مرکزی کردار ہے، کی اس اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے کی مشکلات اور جدوجہد کو اپنے
افسانے کا موضوع بنا کر جس لفظی ترتیب سے پیش کیا ہے، وہ اسے لازوال بنا دیتا ہے۔

آتش بیاں

جب ہم سوچتے رہتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا.....؟

کیا!

سالہا سال سے ''یہ کیا'' ہمارے ذہنوں میں ہیبت کے بوجھ تلے دبا رہا۔

اور پھر اس ''کیا'' کا سفر اس شام شروع ہوا جب ہمارے اس چھوٹے سے شہر کو کالی آندھی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ ناگوں کے بدنوں پر لوگوں کا جم غفیرا ابھر آیا۔

اس بڑے میدان میں جہاں آوازوں کا شور اب بھی سنائی دیتا ہے وہ شعلہ بیان کہتا تھا:

''جب اندیشے باہر سے ہوں تو ذہن پریشانیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جب خوف باہر سے ہو تو ڈر دل میں پیدا ہوتا ہے۔ خوف اور اندیشے ہماری صدیوں کی غلامی کی دین ہیں۔ جب تک ہم خود اعتمادی سے اپنے آپ کو دور رکھیں گے، تب تک یہ خوف اور اندیشے ہم پر حاوی ہوتے رہیں گے۔

کیا وہ آتش بیاں اب تھک گیا۔ لیکن ہم اس رات سو نہ سکے۔ اور پھر ''کیا'' کا آخری سفر شروع ہوا۔ ہم شانہ بہ شانہ کندھا ملاتے ہوئے نظم و نسق کے ساتھ چلتے رہے۔ جب کرنیں ڈل کے شفاف پانی میں اتر گئیں تو موذن کی آواز سنائی دی۔

''اللہ اکبر'' ....

ہم نے آخری مشت خاک بھی ان پر وار کی۔ اب سوچوں کی جھیل بار بار ہم سے یہ سوال کرتی رہی۔

''اب وہ آتش بیاں کہاں؟''

ہم اندھیرے میں ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے رہے اور کہتے رہے......

''وہ درویش صفت لوٹ آئے گا۔!''

لیکن سوچوں نے پھر ہمیں ''کیا'' کے حوالے کر دیا.....!

تجزیہ:

''آتش بیان'' ایک ایسے رہنما کی علامت ہے جو اپنی قوم، اپنے ملک اور اس سے آگے تمام کائنات میں پھیلے ہوئے ان مظلومین کے رہنما کی علامت ہے جن کا ہر طور استحصال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ جس کے دل میں احتجاج کا جذبہ تو ہے لیکن اس کے بعد یا اس کا انجام ''کیا'' ہوگا۔ یہ ''کیا'' جو خوف کی شکل میں ذہنوں پر مسلط ہے، ''آتش بیان'' شاید اس خوف کو مٹانا چاہتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے لئے آتش بیانی کی کیا ضرورت ہے۔؟

اگر فطری طور پر غور کیا جائے تو کسی اہم مسئلے کی جانب جو کہ عوام کا اپنا مسئلہ ہو لیکن اس کو اس کا کم احساس ہو یا بالکل نہ ہو تو، متوجہ کرنے کے لئے، ان کی رگ حسیت کو پھڑکانے کے لئے ایسے گرم جملوں اور لہجے کی شدید ضرورت ہوتی ہے جس کو عرف عام میں آتش بیانی کہا جاتا ہے اور یہ لہجہ اور یہ جملے اختیار کرنے والے کو ''آتش بیان''۔

لیکن جب عوام اس قسم کی قربانی دینے یا مصائب برداشت کرنے سے خوف کھائے جو کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے راستوں پر چلنے والوں کا مقدر ہے، تو وہ قابض طاقتیں اس رہنما کو برداشت نہیں کرتیں۔ اور ایسے متعدد ''آتش بیان'' کا انجام جو ہوا اور ہو رہا ہے، اور عوام کا اس پر کیا ردعمل ہوتا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کون ''آتش بیان'' بننا چاہے گا، یہ ایک اہم سوال ہے، کیوں کہ اس کا نتیجہ جو فی الحال سامنے ہے وہ یہ ہے۔

''کیا وہ آتش بیاں اب تھک گیا۔ لیکن ہم اس رات سو نہ سکے۔ اور پھر ''کیا'' کا آخری سفر شروع ہوا۔ ہم شانہ بہ شانہ کندھا ملاتے ہوئے نظم و نسق کے ساتھ چلتے رہے۔ جب کرنیں ڈل کے شفاف پانی میں اتر گئیں تو موذن کی آواز سنائی دی۔

''اللہ اکبر''.......

ہم نے آخری مشت خاک بھی ان پر وار کی۔ اب سوچوں کی جھیل بار بار ہم سے یہ سوال کرتی رہی۔

''اب وہ آتش بیاں کہاں؟''

ہم اندھیرے میں ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے رہے اور کہتے رہے......

''وہ درویش صفت لوٹ آئے گا۔!''

لیکن سوچوں نے پھر ہمیں ''کیا'' کے حوالے کر دیا.....!''

کندھے سے کندھا ملا کر نظم و نسق کے ساتھ چلنا اور آخری مشت خاک وار کرنا قبرستان میں کسی جنازے کی تدفین کا منظر معلوم ہوتا ہے۔ایک ایک جملے معنوی اعتبار سے ایک تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔اپنی غفلت سے متعدد آتش بیانوں کو کھو دینا اور اپنی نا اہلی اور مفاد پرستی کے اندھیروں میں آتش بیان کو تلاش کرنا جہاں مردہ ضمیری کی علامت ہے وہیں حد درجہ جہالت اور آرام پرستی کی بھی کہ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے، کوئی آ کر ہمارے مسائل بیٹھے بٹھائے حل کر دے۔ایسی امید اور جہالت اور بزدلی کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو یہ تسلی دینا کہ وہ درویش صفت لوٹ آئے گا، یعنی پھر کوئی ان کی رہنمائی کے لئے کھڑا ہو گا یا اوپر والا ان کی مدد کے لئے کھڑا کرے گا، یہ سب اس ''کیا'' کے خوف سے فرار ہونے کی جھوٹی تدبیریں ہیں جن سے اصل میں فرار ممکن بھی نہیں ہے۔وحشی سعید نے اس افسانے میں تمام دنیا کے بے حس مظلومین، اپنی قسمت سمجھ کر مصائب برداشت کرنے والے ذہن اور انہیں کے درمیان کے تھوڑے مفاد کے لئے استعمال ہو جانے والے ضمیر فروشوں کو یہ ایک اہم پیغام دیا ہے۔

طلسم کلام

وہ شہر جہاں سیمنٹ اور لوہے کے بنے ہوئے قفس آسمان کو چھو رہے تھے!

وہ شہر جہاں چمنیوں سے نکلا ہوا کالا دھواں سینوں میں دفن ہو جاتا تھا!!

وہ شہر جہاں رات دن کے آغوش میں دم توڑتی تھی......!!!

اس شہر میں موت زندگی سے بھاگ کر سمندر کی تہوں میں گم ہو جاتی تھی۔ اس اجنبی شہر میں ہم سوداگر بن کر وارد ہوئے۔ بہت دنوں تک ہم اس شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے رہے۔ پھر ہم اس شہر سے ہجرت کے لیے بستر باندھے کھڑے تھے کہ خضر ملا۔ وہ کہہ پڑے۔

''کہانیوں کے سوداگر! ہمارے اس شہر میں.....!''

''سوداگر ہوں، حضور سوداگر!!''

''کیا نام رکھا ہے اپنی کہانی کا.....!''

''طلسم ہوش ربا!''

''خوب! نام تمہارا، کام ہمارا!''

''لیکن.....!'' ہم بطور احتجاج بول پڑے۔

''فاقے.....سوداگر.....فاقے....''

ہم خاموش ہی رہے۔

طلسم ہوش ربا کے پہلے صفحے پر مختلف اقسام کی ضیافتیں اندراج تھیں۔

اور دوسرے صفحہ پر سمندر کے کنارے خوبصورت بنگلہ، گیٹ کے سامنے ایک بڑی گاڑی.....اور نہ جانے کیا...کیا!!!

تیسرے صفحہ پر مہ جبیں اپنے دست نازک میں بلوری آہنگ میں جام لیے کھڑی تھی۔

ہم تو صرف طلسم ہوش ربا کے ان اوراق سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک دن خضر

نے پکارا......

''طلسم!'' ہماری نئی ہیرئن۔

''لیکن میں تو صرف......''

''معاوضہ معقول ہوگا۔''

طلسم ہوش ربا نے کہا:

''کلام.....''

''خوب.....بہت خوب!!'' خضر خوشی سے اچھل پڑے.....

پھر ہم کلام سے ملے.....

وہ کلام جو ہمارے دل کے اس خانے میں رہتی تھی جس کا دروازہ ہم نے بند کیا تھا۔

وہ میرے اس شہر کی تھی جہاں ہم نے ہر درگاہ پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔

تب وہ نہ کلام تھی اور نہ میں طلسم ہوش ربا تھا۔

میں صرف کالج کے چپراسی کا ایک لڑکا تھا! اور......وہ کالج کے لکچرار کی بیٹی تھی.....!

بہت دنوں ہم لکچرار اور چپراسی کی کشمکش میں ڈوبتے اور ابھرتے رہے، پھر چپراسی کے رزق پر جب خطرہ لاحق ہوا، ہم نے اس شہر کو الوداع کہا۔

اب یہ لکچرار کی بیٹی اس سنگ زار شہر میں کیوں؟

ہم بہت دنوں تک ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہے، نہ میں اپنے وعدے پر اٹل رہا، نہ وہ لکچرار کے حکم کی تابع رہی۔

یہ سب دیکھ کر لکچرار آپے میں نہ رہے۔ لیکن سورج سمندر میں اتر چکا تھا۔ وہ رشتوں کو ٹکڑے کر کے اپنے شہر واپس چلا گیا۔ یہی کیفیت کچھ خضر کی بھی تھی جس نے کلام کو اپنی کہانی کے لیے ناموزوں قرار دیا۔ اور مجھے بھی اپنے عتاب کا شکار بنایا۔

لیکن کلام مجھ میں اور میں کلام میں اپنے آپ کو تلاش کرتے رہے۔ تنہائی.....البتہ یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

طلسم ہوش ربا کے دوسرے صفحے کے ساتھ ساتھ اب پہلا صفحہ بھی بند ہو گیا۔ اس ناگہانی آفت سے فرار مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں نے لاکھ جتن کیے کہ طلسم ہوشربا کے اوراق پھر

سے کھل جائیں لیکن ناکامی نے ساتھ نہ چھوڑا۔

اور ایک بار پھر خضر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

خضر نے مسکراتے ہوئے کہا:

"طلسم! تم میرے عزیز ہو۔ کلام کو ہیروئن بنا کر جو خطرہ ہم لے رہے ہیں وہ معاوضہ طلب ہے۔"

کلام اور میں دونوں بہت رات تک جاگتے رہے..... پھر میری آنکھ کب لگ گئی.... کہ طلسم ہوش ربا کے سارے کے سارے اوراق میرے سامنے بکھرے پڑے تھے..... لیکن طلسم کی کلام ٹوٹ گئی تھی۔

تجزیہ:

''طلسم کلام''، یعنی گفتار کا جادو یا سحر انگیز گفتگو جو حقیقی نہ ہو لیکن حقیقت کی طرح ہی اپنے ارتقائی لمحات میں متاثر کن ہو جس سے اس کے اختیار کرنے والے معاشی طور پر مستفید ہوں۔ وحشی سعید نے اس افسانے میں طلسم اور کلام کو کرداروں کی صورت میں بھی برتا ہے اور ایک ایسے ترقی یافتہ شہر کی بنیاد بھی ثابت کیا ہے جہاں انسانی جذبات کی کوئی قدر نہیں۔ دن رات کام کرنے اور دنیاوی ترقی کے مقابلے میں جہاں آرام حرام ہے۔ رات کا وقت جو کہ آرام اور سکون کی علامت ہے، وہ بھی دن کی جد و جہد میں شامل ہو گیا ہے۔

''وہ شہر جہاں سیمنٹ اور لوہے کے بنے ہوئے قفس آسمان کو چھو رہے تھے!

وہ شہر جہاں چمنیوں سے نکلا ہوا کالا دھواں سینوں میں دفن ہو جاتا تھا!!

وہ شہر جہاں رات دن کے آغوش میں دم توڑتی تھی......!!!''

کرداروں اور مکالمہ نگاری سے محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر میں ڈرامہ، فلم جیسے مظاہرے معاشی خوشحالی کا اہم وسیلہ ہیں۔ ان کے لئے کہانیوں کی تخلیق پہلی ضرورت ہے جو کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان میں سماج کی اصلاح کا پہلو بھی ہوتا ہے، محض لطف اندوزی کا بھی اور ایسی حیرتوں کا بھی جس کا اثر سماج پر منفی ہو یا جو بھی ہو لیکن وہ منافع کا سودا ہو۔

اس شہر میں کہانیوں کا سوداگر اپنی سماجی اصلاح کی کہانیاں لئے ہوئے وارد ہوتا ہے اور بہت خاک چھاننے کے بعد واپسی کا ارادہ کرتا ہے کہ اس کی ملاقات ایک ایسے ''خضر'' صورت سے ہوتی ہے جو ان کی رہنمائی کرتا ہے اور کامیابی کے راستے بتاتا ہے۔

کہانی کا سوداگر اب طلسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ طلسم جو جادو اور فریب کا استعارہ بھی ہے۔ کلام جو اس کی کہانی کی نئی ہیروئن ہے، کہانی کے سوداگر کی کالج سے محبت تھی، لیکن دونوں کے والدین کے پیشوں میں چپراسی اور لیکچرار کے فرق اور اس سبب سے چپراسی کے روزگار پر خطرے نے دونوں کو جدا کر دیا تھا، لیکن یہ جدائی بھی عارضی ثابت ہوئی اور

اس شہر نے انہیں پھر ایک دوسرے کے سامنے کر دیا۔ لکچرار کا کردار یہاں زندگی کے مقدس اور اخلاقی اصولوں کے آئینے کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے، جس کی کوئی اہمیت اس شہر میں نہیں ہے۔ اور وہ کہانی جو ''طلسم ہوشربا'' جیسی اصلاحی ہو، اس شہر والوں یا اس جیسے شہری ذہن رکھنے والوں کے لئے ناموزوں ہے، لہٰذا اس میں ردوبدل ضروری ہے ورنہ اس شہر میں سوداگر کے لئے فاقہ کشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ کلام جو ہیروئن بنائی جارہی ہے، اس کو ہیروئن بننے کے لئے کیا کرنا پڑے گا، اس کا اندازہ اس جملے سے ہو جاتا ہے۔

''طلسم! تم میرے عزیز ہو۔ کلام کو ہیروئن بنا کر جو خطرہ ہم لے رہے ہیں وہ معاوضہ طلب ہے۔''

اس طرح افسانے کا اختتام ہوتا ہے کہ ''خضر'' جو اس فلمی یا ڈرامے کی دنیا کا رہنما ہے، اس کی ہر بات ماننی پڑتی ہے ''طلسم ہوش ربا'' جو ایک اصلاحی کہانی تھی، اس کے اوراق بکھر جاتے ہیں اور طلسم کی کلام بھی مصائب سے ٹوٹ کر خضر کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی ہے۔

وحشی سعید نے علامتی اسلوب میں فلمی یا ڈرامہ کی دنیا کے ان حقائق کا اپنے اس افسانے میں انکشاف کیا ہے جو اکثر پردے میں رہ جاتے ہیں۔

پہچان

وہ اپنی انا کے سامنے اپنے مزاج کی خودسری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ کشمکش اس کی ذات کے لیے بڑی تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ اب وقت کے ساتھ یہ احساس بھی حاوی ہونے لگا کہ اپنے سرمایۂ حیات کا سب سے حسین بت خود مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس لمحے اس نے اپنے دل کو نیزہ کی نوک پر محسوس کیا۔

وہ ٹوٹتا رہا۔

آہستہ آہستہ خودسپردگی کا عنصر اس پر قابو پانے لگا۔ وہ جب اپنے بت کو چھونے لگا، بت نے کہا:

''تم کون؟''

''میں یوسف!''

اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔

''تم یوسف نہیں ہو.....!''

اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

تجزیہ:

''پہچان'' ذات کی کشمکش کا آئینہ دار ایسا افسانہ ہے جو ہر ذی حس اور ذی شعور کے آج کے عہد کے باطنی مسئلے کو نمایاں کرتا ہے۔ ظاہر اور باطن کی کشمکش میں اکثر یہی ایک راستہ بچتا ہے کہ ظاہر کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے باطن کے مقدس اصولوں سے ممکنہ حد تک صرف نظر کیا جائے۔ گھریلو ذمہ داریاں، بال بچوں کے بہتر زندگی گزارنے کے حقوق وغیرہ۔ لیکن اس کے بعد باطن کا وہ تقدس کہاں باقی رہتا ہے۔ حساس ذہن اس کو محسوس کرتے ہوئے یہ کرب ناک اذیت اپنے ساتھ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ''یوسف'' جو ہر قسم کی شفافیت کی بھی علامت ہے، خود سپردگی کی مصلحت کے ساتھ خود کے شفاف ضمیر سے بھی یہی امید رکھتا ہے کہ یہ بھی مصلحت کے بت کی طرح صرف نظر کرے۔ بت جو نہ کچھ دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، ہر احساس سے عاری، پتھر کی مانند۔ لیکن ضمیر پتھر کا بت نہیں ہے، وہ باطن کا آئینہ دار ہے۔

''تم کون؟''

''میں یوسف!''

اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔

''تم یوسف نہیں ہو.....!''

ضمیر کے اس جواب کا جو حساس ذہن پر اثر ہونا تھا وہی ہوا۔

''اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔''

وحشی سعید نے اس افسانے میں جہاں ذات کی کشمکش کو اجاگر کرتے ہوئے حساس ذہن کی زندگی کے ساتھ سفر کرتی اور زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جانے والی اذیتوں کی کامیاب عکاسی کی ہے وہیں اس حقیقت کو ذہن نشیں کرایا ہے کہ ضمیر ہر حال میں حقائق کا پاسباں ہوتا ہے۔

خودسری

وہ رات لمبی اوراذیت ناک تھی۔ کبر کے جھرمٹ میں زندگی کی ساعتوں کو جب اس نے دم توڑتے ہوئے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ کہیں کسی حسین شاہکار کی تکمیل کے لیے بھیانک اندیشے بھی زندگی کے ساجھی دار بنتے ہیں۔ وہ دیر تک اپنے دل کو آنے والی دلفریب آشاؤں سے بہلاتا رہا۔ پھر اچانک کسی نے اسے خواب شیریں سے جگایا۔ وہ سفید گون پہنے ہوئے قدآور شخص اپنی آہنی آواز میں کہنے لگا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری خودسری تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔

لیکن.....

قدآور شخص نے آگے کہا:

''شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے اب تو معمار بھی ٹوٹ گیا۔''

وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔

تجزیہ:

''خودسری'' اپنے باطن یا ضمیر کی سرپرستی میں زندگی گزارنے والے ایسے فرد کا اشاریہ ہے جس نے مقابلہ کرنے کی عمر تک تمام مصائب کا سامنا کرتے ہوئے ان مقدس اصولوں پر زندگی گزاری جو بعد از مرگ دوسری زندگی میں حاصل ہونے والی راحتوں کی بشارت دیتے ہیں۔ لیکن عمر کے آگے ایک ایسی عمر بھی آتی جس میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی اور اگر اسی قسم کی شاہکار زندگی کی تکمیل کا مستحکم ارادہ ہو تو وہ بھیانک اندیشے زندگی کی حقیقت بنتے ہیں جن پر صبر وضبط کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

جانکنی کی لمبی اور اذیت ناک رات جب حساس دل دماغ اپنی گزاری ہوئی تمام زندگی کے لمحات کا محاسبہ کرتا ہے تو دل فریب امیدوں کے ساتھ بھیانک اندیشے بھی اس کے ذہن میں گردش کرتے ہیں۔ یہ اندیشے جو خواب یا تصور میں ناکامی کا یقین بھی دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہاری اب تک کی کاوش تمہیں کوئی فائدہ نہ اب تک ملا ہے نہ آگے ملے گا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری خودسری تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔

لیکن.....

قدآور شخص نے آگے کہا:

''شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے اب تو معمار بھی ٹوٹ گیا۔''

لیکن یہی اندیشے ہیں جو فرد کی خودسری کو قائم رکھتے ہیں کہ اسے شاہکار بننے کے لئے ابھی مزید امتحانات سے گزرنا ہے۔

''وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔''

یہی خوف اور اندیشے فطری طور پر آخر کار وہ شاہکار کی تکمیل کرتے ہیں۔ وحشی سعید نے ''خودسری'' کی صورت میں اس فطری قوت کی اس افسانے میں بہترین عکاسی کی ہے جو شاہکار کی تکمیل کرتی ہے۔

گمراہی

جب اس نے اپنے پاؤں ریشمی دبیز قالینوں پر رکھے تو یوں محسوس ہوا کہ جنت کا پہلا نشان ملا۔

وہ سنگ مرمر کے عالیشان محل میں اپنے ماضی اور حال کی ان گنت الجھنوں کو یاد کرنے لگا، جن سے فرار حاصل کرنے کے لیے جتن کر رہا تھا۔

اطلس اور کم خواب کے سجے ہوئے فرنیچر، بلور کے فانوس، چاندی کے برتن..... جب یہ سب اس کی نظروں میں آ گئے تو اسے اپنے مستقبل کے ہولناک اندھیرے اور بھی گہرے ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ شہنشاہی کرسی پر براجمان اپنے درعان کے نکلس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا:

یہ سب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اپنی..... آنکھوں کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔

لیکن..... وہ بے بس آواز میں بول پڑا۔

''سوچ ترقی کے لیے مضر ہے۔''

وہ شخص کھڑا ہوا۔ اور اپنی آہنی سیف میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھ لیا۔ اب وہ اندھا آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

تجزیہ:

''گمراہی'' وحشی سعید کا ایسا علامتی افسانہ ہے جس میں ضمیر فروشی اور مفاد پرستی کے انعام کے طور پر عیش و عشرت حاصل ہوتی ہے، یہ احساس بھی کبھی کبھی ما فی الضمیر سے ابھرتا ہے کہ شاید اس کو پانے کے لئے آنکھوں کو بینائی سے محروم رکھنے کی کوشش بھی بے سود ہوتی ہے اور اپنی بے ضمیری اور مفاد پرستی پر لعنت ملامت کا خیال آ ہی جاتا ہے۔

''یہ سب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اپنی..... آنکھوں کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔

لیکن..... وہ بے بس آواز میں بول پڑا۔''

''لیکن'' والی سوچ اس ترقی اور اس ترقی میں ساتھ دینے والوں کے لئے مضر ہے کیوں کہ اس طرح اس عقیدت کو ہی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جس کے زیر سایہ اچھے برے کی تمیز سے پرے اس عیش و عشرت کو حاصل کیا گیا، اس لئے:

''سوچ ترقی کے لیے مضر ہے۔''

وہ شخص کھڑا ہوا۔ اور اپنی آہنی سیف میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھ لیا۔ اب وہ اندھا آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔''

بینائی کو اپنی آہنی سیف میں محفوظ رکھنا بینائی کو اس طور قید میں رکھنے کے مترادف ہے جہاں سے وہ آزاد نہ ہو سکے، اور یہ کاروبار چلتا رہے۔ وحشی سعید کا یہ افسانہ جابر قوتوں کے اپنے مفاد کے لئے بکنے کو تیار ضمیر فروشوں کی خصلت اور ان کے انجام کی بہترین آئینہ داری کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو تہہ در تہہ کا حامل یہ افسانہ ایک جہان معنی رکھتا ہے۔

سکوت در سکوت

جس سفر کا اختتام ہو گیا، اس کا تذکرہ کرنا بے سود ہے۔ لیکن بشر غلط فہمی کی زنجیر اپنے گلے سے لپٹائے رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دانش کے دریچے اس پر وا کر دیے گئے ہیں۔ پھر یہ منطق بھی تراش لیتا ہے کہ سفر کے اختتام کے بعد نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

وہ ایران سے بھاگا ہوا رستم زماں جس نے ہمارے یہاں پناہ لی تھی۔ جب ہم چھوٹے تھے، تو اس کے کندھوں پر چڑھ کر ساری دنیا گھوم آنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ اور وہ تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا کیونکہ وہ رستم زماں تھا۔ ہم قہقہے لگایا کرتے اور وہ برا مان جاتا لیکن.......

وہ ہمارے ساتھ بہت دنوں تک نہ رہا۔ کیونکہ بچے بچے نہ رہے۔ اب ہمیں بھی یاد آ گیا کہ خلیل جبران نے کہا تھا کہ زمین پر سونے والے بھی وہ خواب چرا لیتے ہیں جن پر اطلس اور کم خواب پر سونے والے اپنا حق سمجھتے ہیں..... شاید یہ میرا اپنا جملہ ہے یا شاید خلیل جبران سے ادھار لیا..... اور کچھ اپنا جوڑ لیا۔

ڈھلتی ہوئی عمر میں آدمی کا اپنا سایہ بھی گھٹتا جاتا ہے۔ سایہ جس کے دراز ہونے پر وہی آدمی گمان کی رسہ کشی کے جال میں الجھ جاتا ہے۔

اب آیئے! ذرا اپنے سندباد جہازی کا افسانہ شروع کریں۔ ہوا یوں کہ پہلے جو سوال اس کی نگاہوں کے سامنے ابھرا۔ اس سے وہ چکرا کے رہ گیا۔ وہ گاؤں کا تھا۔ جس کی محبت، معصومیت اور انسانیت کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کی طرح بے داغ تھی۔

سوال؟

ڈر، خوف، ہیبت.....

لیکن اب اسے کون سمجھاتا کہ اس سوال کا جواب یوں تھا۔

سبز.....زرد.....سرخ

ہر چوراہے پر نہ جانے وہ کتنی بار ان رنگوں سے گذرا۔ہچکی بھی کوئی چھپانے کی چیز ہے؟اور پھر ہچکیاں خاصی شہرت کا بہانہ بن جاتی ہیں۔

''میں تمہارا گھوڑا ہوں.....تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ.....

وہ میرے چار سال کے بچے سے کہتا اور میرا بچہ واپسی میں کہتا:

''چل میرے گھوڑے، دوڑ میرے گھوڑے، کیا تھک گئے تم میرے گھوڑے..... دوڑتے رہو، دوڑتے رہو۔''

چھ گھنٹے پہلے وہ ایکس رے مشین کے سامنے خود ہی کھڑا ہوا تھا۔میں پہلے ایکس رے کو ہاتھ میں لے کر سڑکوں، گاڑیوں، حیوانوں، انسانوں اور اپنے آپ کے بیچ گذرتے ہوئے ڈاکٹروں کے پاس ہانپتے ہوئے پہنچا۔تو گیلا ایکس رے فوٹو میرے ہاتھ سے گر کر ڈاکٹر کے قدموں پر جا پڑا۔

حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ

حی علی الفلاح، حی علی الفلاح

''نماز پڑھنے آؤ، نماز پڑھنے آؤ

نجات پانے آؤ، نجات پانے آؤ''

کل جو کتاب میں نے شروع کی تھی، وہ آج ختم نہ کر پاؤں گا۔اس میں اکثر بیشتر جملے مصنف نے بڑے جذباتی انداز میں لکھے ہیں۔جذبات کا آج کی سائنسی اور تکنیکی دنیا میں کیا کام ہے.....لیکن میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔وہ جب ذبح خانے کے دروازے پر کھڑا ہوا تو.....

''فکر کاہے کی، میں ہوں رستم۔''

اللہ، اللہ، اللہ

لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ

جانے کتنی بار وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترا، جھانکا اور جھانک کر چلا گیا۔

کل علی الصبح کالج جانا ہوگا۔جو لڑکے اس بار بھی ٹیسٹ میں فیل ہوئے ہیں، ان سے

یہ کہنا ہوگا کہ وہ اگلی بار ٹیسٹ میں فیل نہ ہوں۔ ورنہ وہ دوسری جماعت میں نہیں جا پائیں گے۔

میں پکارتا رہا..... چیختا رہا..... چلاتا رہا.......!

ڈاکٹر!..... اگلی بار...... اگلی بار

نقار خانے میں طوطی کی آواز کی اہمیت ہی کیا۔

وہ ٹیکسی کی سیٹ پر پھیل کر رہ گیا.... ٹانگیں کھڑکی سے باہر آگئیں اور ٹیکسی بھاگی جا رہی تھی.... سڑکوں کی خاموشی..... اداسی سب کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی..... تن پر کپڑا، زمین کی مٹی اور..... اللہ اکبر

اجالے کی کرنیں پہاڑوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ قوس قزح میری مٹھی میں بند ہو کے رہ گئی پھر آنسو کیوں؟

میرا ہم شکل پٹرول پمپ کے پاس میری گاڑی کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا.....

پگلے..... تم سے ملنے بھی بہت جلد آ رہا ہوں۔

تجزیہ:

''سکوت در سکوت'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خاموشی در خاموشی۔ یہ خاموشی کس ضمن میں ہے؟۔ یہ خاموشی مرکزی کردار کے ان بیانات جو درجہ بہ درجہ زمانے کے آگے بڑھنے کو کبھی رستم زماں کے تخیلی کردار کے توسط سے تو کبھی سند باد جہازی کے کردار اور واقعہ سے زمانے کی روش کا پتہ دیتے ہیں۔ مرکزی کردار ذہنی مریض کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے جو اسپتال میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں ہے۔ لیکن ان کا جواب شاید ڈاکٹروں کے پاس نہیں ۔یا شاید ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ مرض شاید اپنے آخری مرحلے میں ہے۔ یہ بظاہر بے ربط باتیں بھی اپنے اندر ایک ربط لئے ہوئے آج کے زمانے کے نشیب وفراز اور اقدار و اخلاق کی گرتی ہوئی سطح کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ رستم زماں اور سند باد جہازی جیسے عزم مصمم رکھنے والی وہ شخصیتیں جنھوں نے قوم وسماج کی فلاح کے لئے خود کو وقف کر دیا، ان کی روحوں کا اضطراب اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

''کل جو کتاب میں نے شروع کی تھی، وہ آج ختم نہ کر پاؤں گا۔ اس میں اکثر بیشتر جملے مصنف نے بڑے جذباتی انداز میں لکھے ہیں۔ جذبات کا آج کی سائنسی اور تکنیکی دنیا میں کیا کام ہے.... لیکن میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔ وہ جب ذبح خانے کے دروازے پر کھڑا ہوا تو.....

''فکر کا ہے کی، میں ہوں رستم۔''

اللہ، اللہ، اللہ

لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ''

چھ گھنٹے پہلے کئے گئے ایکسرے کی رپورٹ جو ڈاکٹر کے قدموں پر گر جاتی ہے، اشارہ ہے کہ اب نماز جنازہ کی تیاری کی جائے۔ کالج کے ٹیسٹ میں فیل ہونے کی بے ربط بات دراصل ڈاکٹری ٹیسٹ میں رپورٹ کے فیل ہونے کا اشاریہ معلوم ہوتی ہے، لیکن وہاں تو اگلی

بار محنت کر کے کالج میں داخلہ لیا جا سکتا ہے، لیکن زندگی میں دوبارہ داخلہ لینا ناممکن

ہے۔مرکزی کردار کے یہ پکارنے، چیخنے، چلانے کے باوجود کہ:

''ڈاکٹر!.....اگلی بار......اگلی بار۔

نقار خانے میں طوطی کی آواز کی اہمیت ہی کیا''

وحشی سعید کے اس افسانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آخر تک یہ نہیں کھل پاتا کہ مرکزی کردار ''میں'' ہے جو حاضر راوی بھی ہے اور شاید اس ذہنی مریض ''وہ'' کو لے کر اسپتال آیا ہے یا ''وہ'' جو ذہنی مریض کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ شعور کی رو تکنیک کے استعمال سے پچھلے زمانوں کا عہد حاضر سے انسلاک موضوعاتی سطح پر کرب میں مزید اضافہ کر دیتا ہے جب یہ تمام تصورات اپنی پیچیدگی لئے ہوئے ''وہ'' کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتے ہیں:

''وہ ٹیکسی کی سیٹ پر پھیل کر رہ گیا....ٹانگیں کھڑکی سے باہر آ گئیں اور ٹیکسی بھاگی جا رہی تھی....سڑکوں کی خاموشی.....اداسی سب کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی.....تن پر کپڑا، زمین کی مٹی اور.....اللہ اکبر

اجالے کی کرنیں پہاڑوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔قوس قزح میری مٹھی میں بند ہو کے رہ گئی پھر آنسو کیوں؟''

لیکن آخری دو سطور میں وحشی سعید نے اسی شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے افسانے کے اختتام کے ساتھ ہی اس کے غیر مختتم ہونے کی بھی بشارت دیتے ہوئے کہ:

میرا ہم شکل پٹرول پمپ کے پاس میری گاڑی کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا.....

پگلے.....تم سے ملنے بھی بہت جلد آ رہا ہوں۔''

یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس قسم کے تصورات جو سکوت در سکوت ذہنوں میں پلتے ہیں اور جن کے جوابات شاید ممکن نہیں، ان کا سلسلہ بھی زندگی چلنے کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا ۔شاید دنیا کے ختم ہونے تک۔قیامت کے آنے تک۔

نیا حکمراں

آثار قدیمہ کے ماہرین کی جستجوئے تلاش کے دوران ہتھوڑے کی زد پر ایک قدیم مسودہ ابھر آیا۔ اس مسودے میں داستان گو یوں رقم طراز تھا۔

ہمارے شہر میں صدیوں سے یہ رسم چلی آرہی تھی، کہ جب بھی کوئی اپنی زندگی سے ناطہ توڑ دیتا تو یہ مانا جاتا کہ اس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی نیک نامی کے ساتھ صحبت نہ رکھی، اس لیے اس کے جسد خاکی کو شہر سے دور ایک چوراہے پر گدھوں کی شکم پروری کے لیے رکھا جاتا۔ تاکہ وہ اپنے جسد خاکی سے گدھوں کی بھوک مٹا کے نیک نامی کا دامن تھام سکے۔ لیکن اکثر راہ گیر تعفن سے بچنے کے لیے ناک اور آنکھوں پر رومال رکھ لیتے، شاید وہ اپنے انجام سے شرمندہ ہوتے تھے۔ یا اپنے انجام پر ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ گدھ اپنی بھوک مٹا کے آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتے۔

مسودے میں شاید یہ واقعہ جگہ نہ پا سکا۔ حالانکہ وہ بوڑھا جو اپنی عمر سے بھی زیادہ وقت زندہ رہا۔ اپنی جوانی میں خوب رورہا ہوگا۔ قد وقامت کا بھی اونچا ہوگا۔ انداز گفتگو میں شیرینی بھی.... لیکن اب گدھوں نے اس کا گوشت کھا کھا کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ چھوڑا تھا۔ گدھ اس کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو چبا نہ سکے۔

حالانکہ ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس کے برعکس وہ چپ چاپ جنگل کی گہرائیوں میں کھو گیا۔ پھر آناً فاناً ہڈیوں کے ڈھانچے میں روح داخل ہوگئی۔ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شہر کی جانب روانہ ہوا..... چیخا اور چلایا..... میں آرہا ہوں۔ شہر آج بھی حسب معمول مصیبتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ زندوں کی بستی میں ایک مردہ لاش کی باتوں کو بھلا کون سننے والا تھا۔ زندگی کی خوبصورتیوں میں بدشگونی کے لیے کہاں جگہ ہے؟ ایسے لمحوں میں یہ کہنا کہ دور اندیشی کو اپنا ہی پاسباں سمجھو پاگل پن کی علامت ہے اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے انسان ایک خوبصورت جانور ہے۔

وہ مردہ لاش جب شہر کے چوک پر پہنچی تو سارے شہر کے باشندے اپنی میتوں کا حساب دیے بغیر سو گئے۔

داستان گو نے آگے لکھا تھا کہ اس کے بعد اس کے شہر میں سورج نہیں نکلا۔ شہر کے باشندے غفلت کی نیند سوتے رہے اور یہ محسوس بھی نہ کر سکے کہ اس رات کی صبح نہ ہو گی۔

ان سب کی سوچ مفلوج ہو کے رہ گئی۔ اس لیے وہ مردہ لاش اپنے ہاتھ میں چابک لیے گلیوں اور کوچوں میں گھومتی رہی اور سب اس کے احترام میں سر جھکائے رہے۔ لیکن اچانک دبی اور دبائی گئی بستی میں بغاوت کا پرچم اونچا ہو گیا۔ لیکن بغاوت انقلاب کی نوعیت اختیار نہ کر سکی......اور باغیوں کے سر قلم کر دیے گئے۔

باغیوں کے اس حیران کن اور عبرت خیز انجام پر مردہ لاش خوشی میں اچھلنے اور کودنے لگی اور اس نے ڈھول پیٹ کر یہ اعلان کیا۔

جو لوگ مجھے مردہ اور بے جان سمجھتے ہیں دراصل وہ خود مردہ ہیں اور اپنے احساس کمتری سے فرار حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔

اس دن شہر کے تمام باشندے اپنی حقیقت پر غور کرنے لگے۔ وہ اپنا تجزیہ کرنے لگے۔ لیکن محفل کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی برخاست کر دی گئی۔ آخری مجلس میں یہ بات طویل بحث و مباحثہ کے بعد طے پائی کہ وہ سب کے سب مردہ تھے۔

صدیاں گذرنے کے بعد ایک نوجوان نے ان سے کہا۔

"یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ زندہ زندہ ہے اور مردہ مردہ ہے.....دن کی روشنی روشنی ہوتی ہے اور کالی رات......کالی رات...." زندہ لاش کے اس شہر میں ایک نوجوان کو خبطی کہا گیا....گالیوں سے نوازا گیا.....جوتوں کی بارش کی گئی....پتھروں سے خوش آمدید کہا گیا۔ جس مکان میں اس نے پناہ لی اس کو جلایا گیا....جس راستہ پر وہ چلا.....اس راستے کو کاٹ کر پھینکا گیا۔ لیکن زندہ دل نوجوان کے لیے یہی باتیں مقبولیت کا ہتھیار بن گئیں۔ وہ اپنے مقصد پر ڈٹا رہا۔ بالآخر اس نوجوان کو صلیب پر لٹکایا گیا.....گدھ اس کا انتظار ہی کر رہے تھے.....لیکن اس بار وہ لاش کا گوشت نہ کھا سکے۔

پھر وہ لاش اپنی قوت سے کھڑی ہو گئی......انقلاب کی تختی اپنے گلے میں آویزاں

کی، جو بھی آتا گیا اس کو روندتا چلا گیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کو ہوا میں اچھالا اور زمین پر پٹاخ سے پھینک دیا۔

پھر وہ ہیرو بنا۔ اپنے اقوال کو سنہرے فریم میں ہر موڑ پر آویزاں کرتا رہا۔ وہ شہر کا نیا حکمراں تھا......

شہر ایک بار پھر کالی رات میں سفر کرنے لگا۔ یہ کہتے کہتے داستان گو بھی سو گیا.......

تجزیہ:

''نیا حکمراں'' افسانہ کسی بھی استحصال زدہ ملک وقوم کے حالات کی آئینہ داری اس طور کرتا ہے کہ اس کے اسباب وعلل بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حاضر راوی اس پورے واقعے سے واقف ہے یا اپنے تخیل سے مکمل واقعے تک رسائی حاصل کر سکا ہے جو شاید آثار قدیمہ سے برآمد ہوئے قدیم نسخے میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ یہ بیان کنندہ کون ہے؟ شاید ''وقت'' جس کو وحشی سعید نے غائب راوی کے کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ داستان گو جس کے شہر کے لوگ اتنے حساس تھے یا پھر اتنے معصوم کہ خود کو نیک نام نہ مان کر اپنے جسد خاکی کو گدھوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ ان کی موت کب واقع ہوتی تھی یہ بھی غور طلب ہے۔ زندگی سے ناطہ توڑنا ایک اشارہ ہے کہ وہ زندہ رہتے ہوئے بھی خود کو مردہ مان کر اپنا سب کچھ گدھوں بمعنی استحصالی قوتوں کو سونپ دیتے تھے۔

داستان گو کا جو واقعہ مسودہ میں جگہ نہ پا سکا، اسے وحشی سعید نے وقت کی زبانی مکمل کرایا ہے۔ جس میں اس بوڑھے داستان گو کی حساسیت کی قوت کا ذکر ہے جو اپنی عمر سے زیادہ سے بھی زیادہ وقت تک زندہ رہا، تو سوال اٹھتا ہے کہ کیسے اور کہاں؟ جواب یہ ہے کہ وہ اس مسودے میں زندہ رہا، آنے والی نسلوں کے دلوں میں زندہ رہا۔ اس نے قوم وملک کے غم میں جوانی میں جو آنسو بہائے تھے، یعنی جدوجہد کی تھی، گدھوں نے اس کے جسم کو تو ختم کر دیا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ یعنی اس کے ہونے کی بنیاد ان خیالات وتصورات کو ختم نہ کر سکے۔

وہ خیالات وتصورات سفر کرتے کرتے جنگل کی گہرائیوں یعنی جو علاقے گدھوں کی پہنچ سے ابھی دور تھے، وہاں پھیل گئے اور وہاں سے روح کی توانائی پا کر دوبارہ شہر میں داخل ہو گئے، لیکن وہاں بے حسی بدستور جاری تھی۔ مردہ لاش جو ناکام اور مایوس خیالات وتصورات کی علامت ہے، اپنا کام کرتی رہی، اپنی جدوجہد کا چابک چلاتی رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا احترام کیا جانے لگا یعنی ان پر توجہ کی جانے لگی۔

اسی توجہ نے حقوق کی پامالی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا لیکن اس میں تمام مظلومین کے شامل نہ ہونے سے یہ بغاوت انقلاب نہ بن سکی اور تمام باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں، لیکن یہ اقدار و تصورات کی جیت تھی جن کے لئے اب کچھ لوگ ہی سہی، اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔

اس واقعے نے تمام مظلومین کو یکساں طور پر غور وفکر کے لئے مجبور کیا، یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ ہمارے اندر جدو جہد کی پریشانیوں کو سہنے کی قوت نہیں، اس کا کوئی حل نکالنے سے قبل ہی محفل برخاست کر دی گئی، لیکن وہ ارادے اور تصورات سینہ بہ سینہ صدیوں سفر کرتے رہے۔ وحشی سعید نے اس افسانے میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ظلم کے ساتھ ہی اس سے مقابلے کے جذبات بھی جنم لیتے ہیں خواہ ان جذبات کو پروان چڑھنے میں صدیاں ہی کیوں نہ لگ جائیں، لیکن ایک حقیقت اور ہے کہ جیسے جیسے یہ جذبات پنپتے ہیں، اسی طرح ان کے کمزور کرنے، ختم کرنے کے حربے بھی پنپنے لگتے ہیں۔ آخر جابر قوتیں کیوں کر چاہیں گی کہ ان کی عیش وعشرت کا خاتمہ ہو یا انہیں اس میں دوسروں کو بھی حصہ دار بنانا پڑے۔

سینہ بہ سینہ سفر کرنے والے خیالات وتصورات صدیوں بعد پھر اپنی قوت کے ساتھ اس شہر کے کچھ لوگوں کی صورت میں ابھرے۔ نوجوان جوان کا پیشوا تھا، بے حس قوم کے سامنے وہی بات دہرانے لگا، اور اس کا نتیجہ جو ہوا۔

''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ زندہ زندہ ہے اور مردہ مردہ ہے..... دن کی روشنی روشنی ہوتی ہے اور کالی رات..... کالی رات....'' زندہ لاش کے اس شہر میں ایک نوجوان کو خبطی کہا گیا.... گالیوں سے نوازا گیا..... جوتوں کی بارش کی گئی.... پتھروں سے خوش آمدید کہا گیا۔ جس مکان میں اس نے پناہ لی اس کو جلایا گیا.... جس راستہ پر وہ چلا..... اس راستے کو کاٹ کر پھینکا گیا۔ لیکن زندہ دل نوجوان کے لیے یہی باتیں مقبولیت کا ہتھیار بن گئیں۔ وہ اپنے مقصد پر ڈٹا رہا۔ بالآخر اس نوجوان کو صلیب پر لٹکایا گیا..... گدھ اس کا انتظار ہی کر رہے تھے..... لیکن اس بار وہ لاش کا گوشت نہ کھا سکے۔

پھر وہ لاش اپنی قوت سے کھڑی ہو گئی...... انقلاب کی تختی اپنے گلے میں آویزاں کی، جو بھی آتا گیا اس کو روندتا چلا گیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کو ہوا میں اچھالا اور زمین پر پٹاخ

سے پھینک دیا۔

پھر وہ ہیرو بنا۔ اپنے اقوال کو سنہرے فریم میں ہر موڑ پر آویزاں کرتا رہا۔ وہ شہر کا نیا حکمراں تھا......

شہر ایک بار پھر کالی رات میں سفر کرنے لگا۔ یہ کہتے کہتے داستان گو بھی سو گیا....''

وحشی سعید نے افسانے کا جو غیر متوقعہ اختتام کیا ہے، وہ حیرت میں مبتلا کرنے والا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس بار لاش کا گوشت بھی گدھ نہ کھا سکے، وہ اپنی قوت سے کھڑی بھی ہوگئی، اس کے اوپر ظلم بھی توڑے گئے، لیکن پھر بھی وہ ہیرو بنا اور شہر کا نیا حکمران ۔لیکن شہر ایک بار پھر کالی رات میں کیوں سفر کرنے لگا۔ اور یہ کہتے کہتے داستان گو کیوں سو گیا۔؟ اس کے جواب میں اقبال یا ظفر علی خاں کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

وحشی سعید نے افسانے کا اختتام کسی ملک یا قوم کی اس تاریخی سچائی پر کیا ہے کہ جب اس کو ہیرو بنانے والے بھی اپنی خصلت سے نہیں بدلے تو جابر قوتوں نے اس ہیرو کو ہی بدل دیا۔ اس کو شہر کا نیا حکمراں بنایا اور شہر ایک بار پھر کالی رات میں سفر کرنے لگا۔ وہ ہیرو جو اتنے مصائب کے بعد بھی نہیں بدلا، جن اپنوں کے لئے اس نے مصائب برداشت کئے، جب عملی طور پر اس کے ساتھ نہ آئے حالانکہ اس کا احترام کرتے اور اس کو ہیرو بھی مانتے رہے، لیکن عروج کے سفر پر راستوں کی جن مشکلات کا سامنا تھا، وہ اس قربانی کے لئے قطعی راضی نہ تھے ،تو ہیرو کا بدل جانا یہاں فطری معلوم ہوتا ہے اور اس قوم کی بے حسی کا بھی جو استحصال کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتی۔ اس طرح دوسرے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو مظلوم قوم اب مظلوم نہیں معلوم ہوتی بلکہ جابر قوم کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور نیا حکمراں خود کے اوپر ان کے ذریعہ کئے گئے ظلم کے انتقام لینے کا استعارہ۔

منفی کا قاعدہ

اس شہر کا چوک......!

کبھی سبز! کبھی زرد! اب سرخ کہلاتا ہے۔

اب اس چوک میں ایک کلاک ٹاور بھی نصب کیا گیا ہے۔ جب چوک میں کلاک ٹاور نصب کیا گیا تھا، اس دن سے تنومند نوجوان ٹاور کے سامنے کھڑا ہو کر.....

''بڑا بننے کے لیے راستے کے بڑے پتھروں کو ہٹانا ہوگا.... پتھروں کو ہٹانے کے لیے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرو۔ تم لوگوں کے دل قربانی کے جذبے سے تب معمور ہو سکتے ہیں جب آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بن جاؤ گے..... آؤ میرے دوستو! ہم اندھوں کی طرح ایک ایسی منزل کی جانب روانہ ہوں جس کی نشاندہی کوئی بھی نہ کر سکے۔''

اس شہر کے اردگرد جو پہاڑوں کا سلسلہ ہائے دراز تھا وہ برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی ان پہاڑوں میں ہریالی ہوتی۔ وہاں کی ایک بلند چوٹی پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہتا۔

''میرے ہم وطنو! میرے دوستو! یہ جو میرا جوتا ہے، یہ جو میرا پتلون ہے، یہ جو میری قمیض ہے، یہ جو میری ٹائی ہے، یہ جو میرا کوٹ ہے..... یہ میرے آسودہ حال ہونے کی کہانی نہیں ہے بلکہ میرے ذہن سے اترے ہوئے زنگ کی علامت ہے...... میرے عزیزو! اگر تمہیں اپنی مفلسی سے، اپنی بے بسی سے نجات چاہیے تو پھر اپنے ذہنوں پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتار لو..... میرے مشاہدے سے فیض حاصل کر لو...... منزل حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ میں جذبۂ قربانی پیدا کرو.....''

پہاڑوں کے دامن میں وادی بھی تھی اور اس وادی میں ایک شاہی محل بھی تھا۔ شاہی محل کی آرام گاہ میں شہنشاہ خوابِ شیریں کے عالم میں تھے۔ شہنشاہ کے آرام گاہ کے دروازے

پر وزیر اعظم خصوصی باریابی کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ شہنشاہ جب خواب شیریں سے لوٹ آئے تو انھوں نے اپنی حسین کنیزوں سے کہا:

''آج میری طبیعت کیوں پر ملال ہے؟''

کنیزوں نے کہا:

''ظل سبحانی، شاید ہماری خدمت میں کوئی کوتاہی رہی ہو۔''

شہنشاہ نے نہایت نحیف آواز میں کہا:

''خیر.........! وزیر اعظم کو قدم بوسی کی اجازت دی جائے....''

پھر وزیر اعظم قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے۔ شہنشاہ نے کہا:

''کیا خبر لائے ہو؟''

''عالم پناہ.....وہ سر پھرا ہماری دسترس سے باہر ہو گیا۔''

''کیوں.......وزیر اعظم.....کیوں؟''

''وہ ان کی پناہ گاہ میں چلا گیا جن کے مفادات کی وہ نگہداشت کر رہا تھا۔''

شہنشاہ نے اپنی دم توڑتی ہوئی چیخ میں کہا:

.......''وزیر اعظم ہماری فوجیں.....ہماری فوجیں۔''

لیکن وزیر اعظم جو کچھ کہنے والے تھے وہ بھی کیا کم دھماکہ خیز تھا!

''عالم پناہ....! وہ تو سر پھرا ہے، پرایا ہے.... آج نہیں تو کل ہمارے چنگل میں ہوگا۔ لیکن جب اپنوں میں ہی کالا بھیڑیا ہو گا تب حالات پیچیدہ ہی نہیں مشکل بھی.....!''

شہنشاہ نے اپنے سر پر رکھے ہوئے تاج کو مضبوطی سے پکڑا اور کہنے لگا۔

''ناقابل یقین!......ناقابل یقین!!''

اس دن کے بعد وادی کی تارکول سڑکوں پر فوج گشت کرنے لگی۔ اسی دن ایک معصوم بچے نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''بابا! بندوق کیا ہوتا ہے؟''

''بندوق؟..... بندوق میں جب گولی رکھی جاتی ہے، اور لبلبی دبائی جاتی ہے تو اس گولی سے آدمی مر جاتا ہے.....''

"لیکن! آدمی کو کیوں مارا جائے؟" بچے نے سوال کیا۔

"اس لیے جب کبھی آدمی دوسرے آدمی کا دشمن بن جاتا ہے..... تب..... مظلوم آدمی ہاتھ میں بندوق لیتا ہے!"

اب بچے نے ضد کی.....

"بابا..... پھر مجھے بندوق چلانا سکھاؤ"

اب بھی چوک میں نوجوان وقت کی رفتار پر ضرب لگا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمارا مقصد صرف بڑا ہونا ہی نہیں بلکہ اصل مقصد ہے..... بڑا ہو کے بڑا رہنا ہوگا.....!!!"

وادی میں ایک گول میدان بھی تھا۔ جس کی سرزمین نے نہ جانے کتنے انقلابات اپنے اندر چھپا لیے تھے! آج وہاں سجائے گئے چبوترے کے سامنے ایک قد آور آدمی کھڑا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا..... ناک لمبی تھی..... کان کھڑے تھے..... وہ سامعین سے کہنے لگا.....

"ہم وطنو! آج میں تم لوگوں سے پہلی بار مخاطب ہو رہا ہوں..... آج میں تم لوگوں کے پاس پہلی بار اس لیے حاضر ہوا ہوں..... کہ تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ آج نہ میرا کوئی سر پرست ہے نہ میں کسی کی سر پرستی قبول کرنے کے لیے تیار!"

اس شام وادی کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں ایک بوڑھا آدمی اپنے نوجوان بیٹے سے پوچھ رہا تھا:

"بیٹا! تمہارا نشانہ کیسا ہے؟"

نوجوان نے اپنا سینہ تان کر کہا:

"بابا! رات کے اندھیرے میں اڑتے ہوئے پرندے پر بند آنکھوں سے نشانہ لگا سکتا ہوں....."

باپ نے اپنے حقے سے تمباکو کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا:

"لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی بند آنکھوں سے دشمن کو پہچان پاؤ گے بھی یا.....؟"

چوک پر واقع جو صدر اسپتال تھا وہاں سے ادھیڑ عمر کا سر پھرا نمودار ہوا۔ وہ چاق و چوبند لگ رہا تھا۔ اس کے اعزاز میں جشن صحت کا اہتمام کیا گیا۔ اس جشن میں اس کے معالج

نے کہا:

"اپنی صحت یابی کی خوشی میں تم اپنے معالج کو کیا پیش کر رہے ہو؟"

سر پھرے نے کہا:

"ڈاکٹر میں کل سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔"

وادی کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹا اپنے باپ کے حقہ کی چلم میں تمباکو رکھ رہا تھا بوڑھے نے نوجوان سے کہا:

"اب نشانہ لگانے کے لیے تیار رہو!"

"بابا!......کیا پھر کھیتوں میں کوئی خونخوار جانور گھس آیا ہے۔"

"بیٹے.....انسان اور جانور میں بہت ہی کم فرق ہے.....!"

نوجوان نے اپنی بندوق ہاتھ میں لی.....اس کی صفائی کی....پھر بندوق کی نالی میں کارتوس ڈالنے لگا۔

آج چوک میں تنومند نوجوان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں نہایت نظم وضبط کے ساتھ گاڑیوں کی قطار و قطار کھڑی تھی۔ گاڑیوں میں نوجوان تھا۔ قافلہ کی روانگی کے وقت نوجوان نے چوک پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے کہا:

"الوداع......!الوداع.....!میں آج بڑا بننے اور بڑا رہنے کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں....."

وادی کا نوجوان۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنی بوسیدہ جھونپڑی کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اپنے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے اپنے باپ کا دامن.....پکڑتے ہوئے کمزور آواز میں کہا:

"بابا......!وہ دس تھے اور میں اکیلا تھا۔ نو میرے نشانے سے بچ نہ پائے لیکن دسویں نے مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔"

باپ نے اپنے لخت جگر سے لپٹتے ہوئے کہا:

"لیکن بیٹا ابھی تو بہت آگے جانا ہے!"

"بابا......بابا......اللہ....."

نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم.....توڑ دیا.....

بوڑھے نے نوجوان بیٹے کی لاش خود سپرد خاک کی، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے گھر کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس نے دم توڑا تھا.....

وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

''شروع کرتا ہوں، اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

تجزیہ:

''منفی کا قاعدہ'' افسانہ اور حقیقت کے درمیانی رابطوں کو عبور کرتے ہوئے وحشی سعید کا ایسا افسانہ ہے جو پوری دنیا کے کسی بھی ایسے خطے جو برفیلے پہاڑوں اور سرسبز وادی کے درمیان واقع ہے اور اس کے ایسے مسائل ہیں جو جابر قوموں کے وہ استحصال جو میدانی علاقوں کی دنیاؤں پر ہو رہے ہیں، سے منفرد اس لئے ہیں کہ جو بھی آواز ان کے حق میں بلند ہوتی ہے وہ بالآخر خود گمراہ ہو کر استحصال کرنے والوں کے ساتھ ہو جاتی ہے یا ان کا آلہ کار بن جاتی ہے ، چاہے اس کا سبب عوام کی نفرت ہو، محبت ہو، جس کا فائدہ اس آواز نے اٹھایا ہو یا پھر وہ بھی کسی نہ کسی طور اپنے جان کے خوف سے یا کسی بھی خوف سے، خوشی سے یا غم سے اندر ہی اندر اس کی کایا پلٹ ہو گئی ہو یا کر دی گئی ہو۔

وحشی سعید نے نوجوان سے شہر کے چوک میں نسب کلاک ٹاور کے سامنے کھڑے ہو کر جو تقریر کروائی ہے، اس سے اس قوم کی ذہنیت اور کم علمی یا بنا غور و فکر کے اعتماد کر کے جذباتیت میں بہہ جانے والی فطرت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

''بڑا بننے کے لیے راستے کے بڑے پتھروں کو ہٹانا ہوگا.... پتھروں کو ہٹانے کے لیے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرو۔ تم لوگوں کے دل قربانی کے جذبے سے تب معمور ہو سکتے ہیں جب آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بن جاؤ گے..... آؤ میرے دوستو! ہم اندھوں کی طرح ایک ایسی منزل کی جانب روانہ ہوں جس کی نشاندہی کوئی بھی نہ کر سکے۔''

یہ بنا منزل کے تعین سفر پر چل پڑنے کا جوش اور بڑا بننے کا جنون ان بڑے لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث تھا جو پہلے سے بڑے تھے لیکن ان کی کمزوری کا احساس ان جوشیلے لوگوں کو ہو گیا تھا جو تاریخ بدلنے کے جنون میں مبتلا تھے۔ لیکن اس کے دور اندیش مثبت و منفی نتائج سے بے بہرہ۔

''عالم پناہ..... وہ سرپھرا ہماری دسترس سے باہر ہو گیا۔''

''کیوں......وزیراعظم......کیوں؟''

''وہ ان کی پناہ گاہ میں چلا گیا جن کے مفادات کی وہ نگہداشت کر رہا تھا۔''

شہنشاہ نے اپنی دم توڑتی ہوئی چیخ میں کہا:

......''وزیراعظم ہماری فوجیں.....ہماری فوجیں۔''

لیکن وزیراعظم جو کچھ کہنے والے تھے وہ بھی کیا کم دھماکہ خیز تھا!

''عالم پناہ....!وہ تو سر پھرا ہے، پرایا ہے....آج نہیں تو کل ہمارے چنگل میں ہوگا۔ لیکن جب اپنوں میں ہی کالا بھیڑیا ہوگا تب حالات پیچیدہ ہی نہیں مشکل بھی.....!''

شہنشاہ نے اپنے سر پر رکھے ہوئے تاج کو مضبوطی سے پکڑا اور کہنے لگا۔

''ناقابل یقین!......ناقابل یقین!!''

اس دن کے بعد وادی کی تارکول سڑکوں پر فوج گشت کرنے لگی۔اسی دن ایک معصوم بچے نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''بابا! بندوق کیا ہوتا ہے؟''

''بندوق؟.....بندوق میں جب گولی رکھی جاتی ہے، اور لبلبی دبائی جاتی ہے تو اس گولی سے آدمی مرجاتا ہے.....''

''لیکن! آدمی کو کیوں مارا جائے؟'' بچے نے سوال کیا۔

''اس لیے جب کبھی آدمی دوسرے آدمی کا دشمن بن جاتا ہے.....تب.....مظلوم آدمی ہاتھ میں بندوق لیتا ہے!''

مندرجہ بالا آخری سطور میں وحشی سعید نے لفظ ''بندوق'' کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔تاریخ یہ ہے پہاڑی علاقوں کے باشندے بندوق شکاری جانوروں سے اور چور ڈاکوؤں کے خطرات سے اپنے مویشیوں، گھر زمین، گھر والوں اور خود کو بچانے کے لئے رکھتے ہیں۔معصوم بچے کے سوال ''آدمی کیوں مارا جائے؟'' آدمیت کے تصور کو بھی معنی خیز بنا دیتا ہے۔نوجوان کی بڑھتی ہوئی سرگرمی اور اس سے فائدہ اٹھانے والی قوتوں کے ارادوں کو نہ سمجھ پانے والے جذباتی افراد میں کچھ سنجیدہ جن کو اکثریت کچھ نہیں سمجھتے اور اس کا خمیازہ نسلیں بھگتتی ہیں، آنے والے طوفان کو بھانپ لیتے ہیں، اس بوڑھے باپ نے بھی جو ایک بوسیدہ جھونپڑی

میں رہتا تھا، آنے والے حالات کا اندازہ کر لیتا ہے جس کو وحشی سعید نے ایک کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بوڑھے کو مفلس طبقے کا دکھا کر وحشی سعید نے اس حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے کہ بنا کسی واضح مقصد کے دوسروں کی طاقت کے بھروسے پر بڑا بننے اور بڑا رہنے کے عمل کے دوران فتنہ پروری کا سب سے زیادہ اثر اسی طبقے پر پڑتا ہے، اور اس کے سامنے پھر ذاتی تحفظ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا جو شاید ایک طرح سے ممکن بھی نہیں ہے، لیکن اس فتنہ پروری کی زد میں آنے والی نسلوں کا ردعمل مختلف صورتوں میں جاری وساری رہتا ہے۔ وحشی سعید کے مطابق عمل اور ردعمل کی یہ صورتیں امن وآشتی کی فضا کے لئے ناسازگار ہیں۔

''بیٹا! تمہارا نشانہ کیسا ہے؟''

نوجوان نے اپنا سینہ تان کر کہا:

''بابا! رات کے اندھیرے میں اڑتے ہوئے پرندے پر بند آنکھوں سے نشانہ لگا سکتا ہوں.....''

باپ نے اپنے حقے سے تمباکو کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا:

''لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی بند آنکھوں سے دشمن کو پہچان پاؤ گے بھی یا.....؟''

یہاں ''بند آنکھوں دشمن کو پہچاننے'' کا شعور بھی معنی خیز ہے جس کی فکر اس حساس مفلس بوڑھے کو ہے۔ بہرحال اپنے مقصد میں کامیاب ہونے اور اس خطے کو ایک تصور عطا کرنے کے بعد وہ سرپھرا ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو جاتا ہے، نتیجہ نظم وضبط کے ساتھ ایک قطار میں کھڑی گاڑیوں میں نوجوان کا جانا دوہرے تاثر کو پیش کرتا ہے۔ جب وہ خود سے کہتا ہے، نہ کہ عوام سے۔ یہاں اس کا خود سے مکالمہ افسانے کی معنویت میں بھی حیرت کا اضافہ کرتا ہے۔

''الوداع......! الوداع.....! میں آج بڑا بننے اور بڑا رہنے کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں.....''

وہ دوہرا تاثر جس کا ذکر میں نے اوپر کیا، اس خود کلامی سے منسلک ہو کر جو تصور فراہم کرتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

ا۔ بڑا بننے اور بڑا رہنے یعنی آنے والے وقتوں میں تاریخ میں زندہ رہنے کے لئے میں

اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہوں

۲۔ بڑا بننے اور بڑا رہنے کی قربان گاہ پر میں اپنے ضمیر کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔

گاڑیوں کے قافلے جس میں نوجوان تھا، سے بھی دو اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ وہ گاڑیوں کی قطار جن میں سے ایک میں نوجوان تھا، میں اس کو قید کر کے پوری حفاظت سے زنداں کے لئے لے جایا جا رہا تھا، اور یہ خدشہ کہ شاید کوئی احتجاج ہو، اس لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔

۲۔ اس کو اپنی ضمیر فروشی کے انعام کے طور پر شان و شوکت کے ساتھ وہاں سے لے جایا جا رہا تھا کہ دوسرے بھی دیکھ کے عبرت حاصل کریں کہ اس جیسا عمل کر کے وہ بھی بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لیکن ان اضطرابوں کا اثر عوام بالخصوص مفلس طبقے یا دور دراز بسی ہوئی بستیاں جن کا تعلق دوسری بستیوں سے ایک خاص دوری طے کرنے کے بعد ہوتا ہے، کہ اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کے مسائل ان گھنی شہری بستیوں سے جدا ہیں جہاں ایک چیخ پر جم غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے اور اس کا احساس مظلوم اور ظالم دونوں کو ہوتا ہے، سے مختلف ہے۔ وہ علاقے جہاں چیخیں بھی بہت دور تک سفر نہ کر سکیں اور دوسرے علاقوں سے مدد کی امید بے معنی ہو، پر کیا اثر ہوتا ہے، افسانے کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

''وادی کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹا اپنے باپ کے حقہ کی چلم میں تمباکو رکھ رہا تھا، بوڑھے نے نوجوان سے کہا:

''اب نشانہ لگانے کے لیے تیار رہو!''

''بابا!......کیا پھر کھیتوں میں کوئی خونخوار جانور گھس آیا ہے۔''

''بیٹے.....انسان اور جانور میں بہت ہی کم فرق ہے.....!''

نوجوان نے اپنی بندوق ہاتھ میں لی.....اس کی صفائی کی.....پھر بندوق کی نالی میں کارتوس ڈالنے لگا۔''

اور انجام کار:

''وادی کا نوجوان۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنی بوسیدہ

جھونپڑی کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اپنے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے اپنے باپ کا دامن.....پکڑتے ہوئے کمزور آواز میں کہا:

''بابا......! وہ دس تھے اور میں اکیلا تھا۔ نو میرے نشانے سے بچ نہ پائے لیکن دسویں نے مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔''

باپ نے اپنے لختِ جگر سے لپٹتے ہوئے کہا:

''لیکن بیٹا ابھی تو بہت آگے جانا ہے!''

''بابا...... بابا..... اللہ..... اللہ.....''

نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم.....توڑ دیا.....

بوڑھے نے نوجوان بیٹے کی لاش خود سپرد خاک کی، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے گھر کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس نے دم توڑا تھا.....

وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

''شروع کرتا ہوں، اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

''لیکن بیٹا ابھی بہت آگے جانا ہے'' اور اس بوڑھے کا زمین پر گری ہوئی بندوق اٹھانے کی مجبوری اس ماحول و حالات کا اشاریہ ہے کہ اب کچھ بھی اپنے ہاتھ میں نہیں۔ سب وقت کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک وقت سازگار نہ ہو جائے، نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوری میں یا رضامندی سے زندگی کو اسی سلسلے کے ساتھ آگے سفر کرنا ہے، چاہے اس میں صدیاں گزر جائیں یا کتنے ہی بوڑھے، جوان اور آنے والی نسلیں قربان ہوتی رہیں۔

ایک خاص پس منظر میں تخلیق کئے گئے اس افسانے کو وحشی سعید نے برفیلے پہاڑوں اور سرسبز وادی کے ذکر سے زمین کے خاص خطوں تک محدود کر دیا۔ اگر یہ تذکرہ ایسی صورت میں ہوتا کہ زمین و زماں کا تعین ممکن نہ ہوتا تو میرے خیال میں یہ افسانہ مزید آفاقیت اور امکانات کا حامل ہو سکتا تھا۔

اندراج

سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی اس عمارت کے سامنے ہزاروں افراد تعظیم سے سر جھکاتے اور اپنے دل کی مراد اس ان دیکھی قوت سے کہتے، جس کو تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور جس کا وجود معمہ ہے۔

وہ معمول کے مطابق کلیسا کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس دن اس کو محسوس ہوا کہ کسی کا نحیف ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہ اوپر کی تو اپنے سامنے کلیسا کے پیشوا کو کھڑا پایا۔

اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا:

''مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی میرے محترم!''

پیشوا نے اپنی شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہاں سے معلوم ہوا کہ تمہارا نام آدمیوں کی فہرست میں درج ہے۔''

وہ حیرتوں کے پہاڑ تلے دب گیا اور بولا:

''ناقابل یقین!''

پیشوا نے کلیسا میں واپس جاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں منصب عالی مبارک ہو۔''

اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد وہ اپنے حالات پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا۔ اس نے پھر ایک بار عقل وفہم پر سبقت پائی۔ اسے سوچ نے بتایا کہ اس منصب عالی پر اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینا ہوگا۔ یہ سوچ بذات خود ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے آپ کو اس منصب عالی پر خوش نہیں پا رہا تھا.....!

پھر ایک دن ایسا ہوا..... کہ الف لیلیٰ سے ایک شہزادی چوری چھپے بھاگ کر اس کے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی۔ پھر وقت کا سوداگر اس نازنین کو نیلام کرتا رہا۔

نازنین کو دیکھ کر اس نے کہا:

''میرے پاس رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر ہے...... پیٹ کے لیے دو وقت کی روٹی ہے۔تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ہے۔''

نازنین نے نوجوان کے یہ چند جملے بڑے غور سے سنے۔ پھر وہ بنا کچھ کہے خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔کل تک جو راستے اس کے لیے دھند میں کھوئے ہوئے تھے، آج واضح ہو گئے۔

نوجوان کا گھر بے ترتیبی کا شکار تھا.....

نازنین نے اس گھر میں قدم کیا رکھا کہ ہر چیز میں ایک ترتیب نظر آنے لگی۔ نظم ونسق نے اقتدار سنبھال لیا۔ وہ دونوں اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں رفعتوں کے قلعے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ایک نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہوئے۔

پھر بہت دنوں کے بعد انہیں احساس ہوا.....اس نامعلوم منزل کو کوئی اچھا سا نام دیا جائے۔

اس دن بڑی تیز بارش ہو رہی تھی..... بادل گرج رہے تھے.....اور بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ نازنین اس ہولناک ماحول سے اس قدر سہم گئی کہ وہ نوجوان کی چھاتی کے ساتھ چپک گئی بالآخر وہ بول پڑی:

''مجھے میری منزل کا نام ملا۔''

نوجوان نے اس کی زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا:

''پاگل! دیکھ.....! فٹ پاتھ کے اس پار.....وہ بڑی قدآور عمارت.....وہاں ہی تمہاری منزل ہے۔''

نازنین کی چیخ اس ہیبت ناک ماحول میں ایسی گونجی جیسے کسی سنسان جنگل میں تنہا گھر پر بجلی گر پڑی ہو۔

''مجھے تمہاری اس بے مقصد کھوج اور سوچ دونوں سے انکار ہے۔''

نوجوان اپنے اس جلے ہوئے گھر میں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔اس نے اپنے دل پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔لیکن............صبر وتحمل سے کام نہ لے سکا۔

''تم نے میرے جذبے کو لہولہان کیا..... نکل جاؤ..... یہاں سے نکل جاؤ..... اتنی دور میری نظروں سے کہ مجھے پھر کبھی نظر نہ آنا۔''

نازنین پھر اس دنیا میں واپس چلی گئی جہاں سے وہ آئی تھی.....

نوجوان نے جب اپنے غصے پر قابو پایا، صبر و تحمل کی قبا کو دوبارہ اوڑھ لیا..... تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ پڑی..... وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا بزدل اور ناکارہ نکلا۔

وہ اپنے نام کو مجرموں کی فہرست میں صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آدمیت کا قاتل سمجھ بیٹھا۔ اپنے دل کے اس اضطراب پر قابو پانے کے لیے کلیسا کے سامنے گھنٹوں سر جھکائے کھڑا رہا۔ اچانک اس نے اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کو مس ہوتے ہوئے محسوس کیا تو بوکھلاتے ہوئے آنکھوں کو وا کیا۔ کلیسا کا سب سے بڑا پیشوا اس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔

وہ اپنے پاؤں ہٹاتے ہوئے بول پڑا.....

''محترم یہ کیا؟''

لیکن پیشوا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اب اس کا نام انسانوں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔

تجزیہ:

''اندراج'' وحشی سعید کا ایسا علامتی افسانہ ہے جو کسی بھی ملک یا خطہ جو غلام ہو اور مصائب سے دوچار ہو، کی خوشحالی کے لئے جدو جہد کرنے والے اس فرد یا افراد کی کارکردگی کو پیش کرتا ہے جو قوم و ملک کے لئے مختلف اذیتیں برداشت کرتے ہیں، جس کا کچھ بہتر حل بھی بر آمد ہوتا ہے، لیکن دور اندیشی سے کام نہ لے کر یا پھر جذبات میں آکر یا پھر مزید اعتماد میں آکر کچھ ایسے عمل کر بیٹھتے ہیں کہ انجام کار خود کو لعنت ملامت تو کرتے ہیں لیکن تب تک قوم و ملک مختلف اذیتوں میں گھر چکے ہوتے ہیں اور جن کا ازالہ کے لئے ایک اور بڑی جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

''سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی اس عمارت کے سامنے ہزاروں افراد تعظیم سے سر جھکاتے اور اپنے دل کی مراد اس ان دیکھی قوت سے کہتے، جس کو تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور جس کا وجود معمہ ہے۔''

یہ عمارت ایوان بالا یا ایسے مرکز کا اشاریہ ہے جہاں سے رہنما قوم و ملک کی ترقی کے منصوبے بناتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ عام آدمی جن کی دسترس وہاں تک نہیں ہوتی، اور سیاست کے بارے میں بھی زیادہ علم نہیں رکھتے، اس عمارت سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے رہتے ہیں۔ مزید غور وفکر سے کام لیا جائے تو وہ سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی عمارت سے مراد سپر پاور متحدہ ہائے امریکہ جیسے دوسرے طاقتور ملک اور اس کے ایوان بالا White House جیسی عمارتیں ہیں جہاں سے ترقی پذیر اور پسماندہ ملک کے حکمراں اور عوام کی بہت سی امیدیں وابسطہ ہوتی ہیں۔ ان ایوانوں سے ان دیکھی قوت ان کے لئے جو خارجی پالسیاں بناتی ہے، وہ ان کے لئے ایک معمہ ہی ہے جس میں کب کیا تبدیلی کر دی جائے، سمجھ سے پرے ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار ''وہ'' جو شاید ملک و قوم کی فلاح کے لئے سرگرم عمل ہونے کے باوجود ناکامی کے سبب حسب معمول کلیسا کے سامنے سر جھکائے شاید فریاد کر رہا تھا یا دعائیں مانگ رہا تھا، وہاں کے پیشوا جس نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے

بتایا کہ وہاں سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا نام آدمیوں کی فہرست میں درج ہے، ایسے رہنما کی صورت اختیار کر جاتا ہے جو آدمیت کا پیکر ''وہ'' جیسے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔اس طرح ''آدمی'' کا مفہوم بھی اپنے تمام خصائص کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن اس منصب عالی پر وہ خود کو خوش نہیں پا رہا تھا۔کیوں؟ شاید تقاضائے وقت کی بنیاد پر سنگ مرمر میں ڈھلی عمارت سے بھی کچھ انسلاک ہو گیا تھا۔اس کا انکشاف الف لیلیٰ کی شہزادی جو آزادی یا خوشحالی کی علامت ہے، اس کی تقدیر بنتی ہے تو چھوٹا سا گھر اور پیٹ کے لئے دو وقت کی روٹی اور تن ڈھاپنے کے لئے کپڑا یعنی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل ایک محدود دائرے میں ہی سہی چاہے اس کی حیثیت بے نامی یعنی کسی اہم ذکر کے لائق نہ ہو یا اس جانب توجہ نہ کی گئی ہو، لیکن امن وسکون تو دیتی ہے۔مسئلہ وہاں شروع ہوتا ہے جب خود کو اہم بنانے کے لئے دنیا کی نظروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جائے۔تب ایک دوسرے کے مفاد ٹکراتے ہیں تو انتشار واضطراب وجود میں آتے ہیں۔تیز بارش، بادل کا گرجنا، بجلیوں کا کڑکنا یہ تمام اس کی علامتیں ہیں جن سے آزادی یا خوشحالی کی علامت وہ نازنین خوفزدہ ہو جاتی ہے اور ''وہ'' پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی منزل کی شناخت سمجھتی ہے۔لیکن جب اسے علم ہوتا ہے کہ زیادہ پانے یا نمائش کی ہوس یا اس جانب کیئے گئے عمل نے ''وہ'' کو بھی اب آدمی کی فہرست سے باہر کر دیا ہے جن کا انکشاف اس طرح ہوتا ہے۔

''نوجوان نے اس کی زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا:

''پاگل! دیکھ.....! فٹ پاتھ کے اس پار.....وہ بڑی قد آور عمارت.....وہاں ہی تمہاری منزل ہے۔''

نازنین کی چیخ اس ہیبت ناک ماحول میں ایسی گونجی جیسے کسی سنسان جنگل میں تنہا گھر پر بجلی گر پڑی ہو۔

''مجھے تمہاری اس بے مقصد کھوج اور سوچ دونوں سے انکار ہے۔''

نوجوان اپنے اس جلے ہوئے گھر میں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔اس نے اپنے دل پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔لیکن ....صبر وتحمل سے کام نہ لے سکا۔

''تم نے میرے جذبے کو لہولہان کیا.....نکل جاؤ..... یہاں سے نکل جاؤ.....اتنی

دور میری نظروں سے کہ مجھے پھر کبھی نظر نہ آنا۔''

نازنین پھر اس دنیا میں واپس چلی گئی جہاں سے وہ آئی تھی.....''

لالچ، ہوس یا اپنی حیثیت اور امکان سے زیادہ پانے کی خواہش جو خود کو سہی ثابت کرنے کے لئے غصے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اس سے ''وہ'' اپنی نعمتیں بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ غصے پر قابو پانے اور صبر و تحمل سے غور کرنے پر اسے احساس ہوتا ہے کہ عزم راسخ پر اپنی قوت بھر عمل نہ کر سکا۔

''نوجوان نے جب اپنے غصے پر قابو پایا، صبر و تحمل کی قبا کو دوبارہ اوڑھ لیا..... تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ پڑی..... وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا بزدل اور ناکارہ نکلا۔''

لیکن یہی ندامت اور خود احتسابی جو اسے خود کو مجرموں کی فہرست میں شامل ہونے کے لئے ملامت کر رہی تھی از سر نو جد و جہد اور کاوشیں کرنے کا پیش خیمہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس کا احساس پیشوا کو بھی ہو جاتا ہے۔

''وہ اپنے نام کو مجرموں کی فہرست میں صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آدمیت کا قاتل سمجھ بیٹھا۔ اپنے دل کے اس اضطراب پر قابو پانے کے لیے کلیسا کے سامنے گھٹنوں سر جھکائے کھڑا رہا۔ اچانک اس نے اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کو مس ہوتے ہوئے محسوس کیا تو بوکھلاتے ہوئے آنکھوں کو وا کیا۔ کلیسا کا سب سے بڑا پیشوا اس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔

وہ اپنے پاؤں ہٹاتے ہوئے بول پڑا.....

''محترم یہ کیا؟''

لیکن پیشوا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اب اس کا نام انسانوں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔''

یہاں افسانہ ختم ہوتا ہے۔ تاریخی غلطیوں سے سبق لے کر از سر نو اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام اور اس احساس بھر سے اہل دانش کے یہاں عزت و احترام کا جو نقشہ وحشی سعید نے اپنے اس افسانے میں پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ معلوم ہوتا ہے۔

ارتقا کا سانحہ

سورج سر پر آ گیا۔ لیکن وہ بوڑھا ضعیف، ریش دراز آدمی اب بھی عبادت میں محو ایسے ہی آنکھیں موندے ہوئے تھا، جیسے وہ چھ گھنٹے پہلے تھا۔ وہ دونوں زانوں میں سر ڈالے ہوئے اس کے سامنے تھے۔ ان دونوں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے متعلق فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ماحول کی سحر انگیزی نے ان دونوں کو بت بنا کے چھوڑا تھا۔ ان میں ایک قد کا دراز تھا اس کی آواز میں مٹھاس تھی اور گفتار میں جادو کا اثر۔ وہ اپنے آپ کو شیر دل کہتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہر غلط یا صحیح فیصلے پر اسی طرح اٹل رہتا تھا جیسے پتھر کی لکیر......

دوسرا نوجوان قد کا چھوٹا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اکھاڑے کا شیر نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے آپ کو فہم و ادراک کا خزانہ سمجھتا تھا، اس لیے یار دوستوں نے اس کو مفکر کا نام عطا کیا تھا۔

جب سورج ڈھلنے لگا..... آنے والے اندھیرے میں ضعیف ریش دراز آدمی نے ان دونوں کے سامنے سکہ پھینکا۔ دونوں سکے پر جھپٹ پڑے۔ لیکن شیر دل فولادی بازو، پہلوانی جسم اور چٹان کی مضبوطی رکھتا تھا۔ اس لیے سکہ اس نے اپنے ہاتھ میں فوراً لے لیا۔ بعد میں جب دن کے اجالے میں اس کو معلوم ہوا کہ سکہ کھوٹا ہے، اس نے غصہ میں آ کر بوڑھے ریش دراز آدمی کی لعنت ملامت کرنی شروع کی۔ اور غصے کی انتہا میں سکہ کو پھینکنے والا تھا کہ مفکر نے ہاتھ پکڑا اور کہا:

"کبھی کبھی برے وقت میں کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے۔"

اب تو قلعے تک پہنچنے کے لیے دونوں نے مہم کا آغاز کیا۔

حالانکہ قلعے تک کیسے پہنچا جائے اور وہاں کن کن دشوار گذار راستوں سے گذرنا ہوگا، اس سے وہ دونوں بے خبر تھے۔ وہ انجام سے بھی بے خبر تھے..... مگر ولولہ، جذبہ اور جوش ان کی

رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ شیر دل نے کھوٹے سکے کو تصویر بنا کر اپنے گلے میں آویزاں کیا۔

پھر سفر میں کچھ ایسے مقام بھی آئے جہاں انسانوں کو نیزوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ شیر دل کے جذبات مجروح ہوگئے۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ اس نے اپنی سحر بیانی کو مفکر کے مقولوں سے سجایا اور سنوارا۔ پھر اس بستی میں قہر نے سب کو اپنے ساتھ بہا ڈالا۔

شیر دل اپنے قبیلے کا سردار بن کے ابھرا۔ لوگوں کے دلوں میں شیر دل کو جب عزت کا مقام ملا..... تو اونچی خانقاہوں میں بیٹھا ہوا بوڑھا پیشوا غضبناک ہوگیا.....

اس نے اپنے فوجی دستے کی مدد سے شیر دل کو گرفتار کرا کے خانقاہ میں اپنے سامنے پیش کرایا..... بوڑھے پیشوا کی شہادت والی انگلی حرکت میں آگئی۔ تو شیر دل کو تختۂ دار کی طرف لے جایا گیا۔ لیکن کھوٹا سکہ کھوٹا تھا۔ وقت پر کام آگیا۔ نہ صرف شیر دل کی جان بچائی بلکہ ان کے سب سے بڑے دیوتا کا منصب بھی عطا کروایا۔

کل تک وہ ایک ادنیٰ فرد تھا..... جو گمنامی کی دنیا میں ایسے بھٹک رہا تھا، جیسے ایک دیوانہ اپنی دیوانگی کے عالم میں اکیلے سفر کر رہا ہو، لیکن آج منصب شاہی نے اس کی ہر ادا میں ایک انوکھا، نرالا اور دل فریب انداز بخش دیا۔ اب جب بھی وہ آئینے کے سامنے اپنے سر پر تاج رکھتا تھا تو آئینے سے کہتا تھا۔

"..... میں ..... میرا سر ..... اور میرا تاج!"

اب رقاصہ کا رقص شروع ہوا۔ اس کے بدن کا انگ انگ تھرکنے لگا۔ شہنشاہ اس کی ہر ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ فریفتگی نے جب دیوانگی کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو مفکر نے ٹوکتے ہوئے کہا:

"اسے چھوا تو جا سکتا ہے، لیکن چکھا نہیں جا سکتا۔"

لیکن رقاصہ تو رقاصہ تھی، وہ دعوت عیش کو بام عروج پر پہنچانے کا ہنر خوب جانتی تھی، وہ اپنا ہر قدم ناپ تول کر آگے بڑھا رہی تھی۔ پہلے پہل اس نے اپنی کالی کالی آنکھوں کو الماس کی طشتری میں سلیقے سے پیش کر کے شہنشاہ کو اپنے تخت پر کھڑا کیا، لیکن بوڑھا پیشوا..... اپنے آباؤ اجداد کی روایت کو توڑنا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا..... اس لیے اس نے

شہنشاہ کے حضور میں دوزانو ہو کر اپنے عصا کو تھامتے ہوئے نہایت عاجزانہ آواز میں کہا:

"ہمارے آقا! ہمیں ایسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالیے..... جہاں ہمارا صبر جواب دے جائے۔ ہماری عزت ہمیں للکارتی رہے گی.... ہمارے آقا! ہم سے ہماری اولادوں کی قربانی..... مانگیئے..... جائدادیں مانگیئے، ایمان مانگیئے، لیکن ایسا فیصلہ نہ سنائیے جس سے قہر نازل ہو جائے۔"

شیر دل آئینے کے سامنے اپنے تاج کی جھالروں کو ترتیب دے رہا تھا، لیکن مفکر.... فکر اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیر دل مفکر کی بزدلی پر زیر لب ہنس رہا تھا، اب مفکر سے نہ رہا گیا، اس نے کہا:

"مانا کہ تم دیوتا بنے ہو، لیکن تم انسان ہو...... ہزاروں خواہشات ہیں تمہاری، لیکن ایسی خواہش کا اظہار ہی کیا کرنا جو ہمارے ہی وجود کو ڈس لے۔"

لیکن رقاصہ کے پاؤں اب بھی فرش پر تھرک رہے تھے۔ نہ جانے وہ حسن کا جادو تھا یا رقاصہ کا فن کہ وہ بلندیوں کو چھونے لگی۔ اس نے اپنے گلاب جیسی پنکھڑیوں والے ہونٹوں کو نئے نئے زاویے اور موڑ دیے۔

شہنشاہ دیکھتا رہ گیا۔ ایسے ہونٹ صرف پوجنے کے لیے ہوتے ہیں..... چکھنے کے لیے نہیں۔ لیکن وہ اپنی ابھرتی ہوئی خواہش کو سلا دینے والا صالح کہاں! اس لیے شہنشاہ اپنے روئے شریف سے گستاخ مکھی کو ہٹاتے ہوئے مفکر سے کہنے لگا:

"ہم تو غلام ہیں روایات کے۔ روایت کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ وقتوں سے چلا آرہا ہے..... خاندان کا تصور! اس تصور سے فرار نا ممکن ہے..... اور روایت سے انحراف کرنا دراصل خود کو نیست و نابود کرنے کے مترادف ہوگا۔"

مفکر پہلی بار شیر دل کے سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ اپنی دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں کہنے لگا:

"تلواروں کی نوک کب روایت کو برقرار رکھتی ہے۔ فہم و ادراک یہی کہتا ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے وقت کے تیور پہچان لینے چاہییے..... ورنہ بہتے دریا میں آیا ہوا طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا کے لے جاتا ہے میرے دوست!"

''دوست!''

شیر دل کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔

''میں تمہارا دوست نہیں ہوں، میں......تمہارا شہنشاہ ہوں......میرا اور تمہارا رشتہ ایک شہنشاہ اور مشیر کا رشتہ ہے۔''

مفکر گہری سوچ میں اس لیے نہیں پڑا کہ اس کو دوستی کے کھو جانے کا غم تھا..... ہاں.....دوست کے ڈوب جانے کا غم ضرور تھا.....یہ سانحہ کیا کم تھا کہ جس دوست کو وہ ہر سرد و گرم سے بچاتا رہا وہ آج اس کی چھایا بھی نہ بن سکا۔

اب رقاصہ بھی رقص میں محو اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی۔اس کے بدن کے تمام حصے تھرکنے مٹکنے لگے۔وہ مستی کو ہر رنگ میں پیش کرنے لگی۔ایسا ہی منظر ہوش کو آگ لگا دیتا ہے۔ شہنشاہ سے اب رہا نہ گیا۔وہ اپنی آواز میں پہلے والی گرج اور سحر بیانی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔جس کو وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا تھا۔لیکن وہ سحر بیانی اب کہاں؟ شیرینی اب کہاں؟

وہ بوڑھے پیشوا سے کہنے لگا:

''پیشوا سن! میں نہیں چاہتا.....کہ میری موت کے بعد میری قوم صدیوں خون کے آنسو بہاتی رہے اور شہر شہر، گاؤں گاؤں، اپنے دیوتا کی تلاش میں بھٹکتی رہے۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صدیوں سے چلی آ رہی روایت کو توڑ کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈال دوں.....اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے جانے سے پہلے تمہارے لیے ایک دیوتا چھوڑتا جاؤں!.....اس لیے یہ امر اب ضروری بن جاتا ہے کہ ہماری ایک ملکہ ہونی چاہیے۔''

پیشوا! جس لڑکی کا ہم نے انتخاب کیا ہے.....وہ ہماری ملکہ بنے گی.....!''

پیشوا کے ہاتھوں سے عصا گر گیا۔وہ اپنی کانپتی ہوئی بوڑھی آواز میں کہنے لگا۔

''لیکن شہنشاہ عالی! جب سے ہماری تہذیب وجود میں آئی ہے، تب سے دیوتاؤں کی شادیاں آسمانوں میں ہوتی چلی آ رہی ہیں.....!''

شہنشاہ اپنے تخت پر کھڑے ہو کر طیش میں آ کر.....کہنے لگا:

''پیشوا.....! میں تمہارا شہنشاہ ہوں اور میرا ہر حکم بجا لانا تمہارا ایمان ہے۔''

پیشوا نے لڑکی سے کہا:

''بدقسمت! اب تمہاری قربانی کا وقت آ گیا ہے۔''

اس کا یہ جملہ سن کے سارا ایوان سکوت میں ڈوب گیا..... لڑکی تھر تھرا اٹھی۔ رقاصہ بھی تھک کر چور ہو گئی تھی۔

بارہ سفید گھوڑے اس بگی کو چلا رہے تھے۔ اطلس اور کم خواب میں ملبوس وہ لڑکی بگی سے اتری..... جس کے سر پر شیر دل ملکہ کا تاج شاہی رکھنے والا تھا۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم پراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا..... جیسے سب کے لب سی دیے گئے ہوں۔ اس پراسرار ماحول میں صرف لڑکی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔

شہنشاہ نے ملکہ کے سر پر تاج رکھتے ہوئے کہا:

''ہم یعنی وقت کے سب سے بڑے شہنشاہ نے تمہیں منصب شاہی عطا کر کے تمہاری زندگی کو جاوداں کر دیا۔ ہماری ملکہ.....!

دعا دو، اس لمحہ کو، جب ہمارے دل میں تمہارے لیے خواہش پیدا ہوئی اور تمہیں خلوت میں جلوہ افروز ہونے کے لیے پسند کر لیا۔''

وہ لڑکی اپنے ہی وطن میں ایک قیدی کی زندگی گذارنے کے لیے قربان گاہ میں بھینٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ خوف سے، ڈر سے..... اور وہم سے کانپنے لگی۔ شہنشاہ جوان کا دیوتا تھا، اس کے لیے ملک الموت کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ اس کی روح کو اپنے قبضہ میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور وہ شہنشاہ کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حصار سے اپنے آپ کو..... بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کیفیت میں وہ اپنے آپ کو آزاد کرنے کی جستجو میں لگی ہوئی تھی۔ جب بازوؤں کے حصار میں وہ بند ہو کے رہ گئی تو موت اب یقینی صورت اختیار کر گئی۔ اس لیے اس نے اپنے موتیوں جیسے سفید دانتوں سے تیز دھار والی تلوار کا کام لیا..... اور شہنشاہ کا بایاں کان کاٹ لیا۔ شہنشاہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ اور اسے ادائے دلبرانا سمجھ کر نازنین کو دوبارہ اپنے بازوؤں کے حصار میں لینے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن جب کٹے ہوئے کان سے سرخ خون کی لکیر شہنشاہ کے رخسار پر پھیلنے لگی تو بوڑھا پیشوا چیخ پڑا.....

''لوگو! یہ دیوتا نہیں ہے..... تم جیسا ایک معمولی حقیر انسان ہے!''

شہنشاہ نے جب لوگوں کا ہجوم اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بوکھلا اٹھا۔ ملکہ کو ایک طرف ڈھکیل اس قہر سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگا۔ تو مفکر نے اسے روکا اور کہا:

''اب وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تم وقت کے ہاتھ میں ہو.....لیکن.....وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں رہے گا، ایک حقیقی شہنشاہ کی طرح موت کو لبیک کہو۔''

کتنے ہی اوراق سیاہ ہو گئے!.....اب تو کہانی کا اختتام ہوا۔ انقلاب آتا ہے اور سب کو روند کے چلا جاتا ہے.....لیکن مفکر اب بھی بستی بستی، گاؤں گاؤں شہر شہر اس فرد کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے سر پر تاج رکھا جائے۔

تجزیہ:

''ارتقا کا سانحہ'' ظاہر ہے کہ یہ عنوان چونکانے والی قوت رکھتا ہے۔ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسی تحیراتی فضا سے دوچار ہوتے ہیں جس کی تہہ در تہہ معنویت تاریخی گوشوں کے ساتھ سبق آموز پہلو بھی رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وحشی سعید نے اپنی فکشن نگاری کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس افسانے میں چند نظریات کو کردار کی ہیت عطا کی ہے اور مکالمہ و منظر سے ایک ایسی مثالی ریاست کا تصور پیش کیا ہے، جس کی عملی صورت شاید اس عہد میں ناممکنات میں سے ہے۔ افسانے کے اختتام کی یہ سطور یہی اشارہ دیتی ہیں:

''کتنے ہی اوراق سیاہ ہو گئے!.....اب تو کہانی کا اختتام ہوا۔ انقلاب آتا ہے اور سب کو روند کے چلا جاتا ہے.....لیکن مفکر اب بھی بستی بستی، گاؤں گاؤں شہر شہر اس فرد کی تلاش میں سرگرداں ہے، جس کے سر پر تاج رکھا جائے۔''

افسانے میں چھ اہم کردار ہیں۔ ایک بوڑھا ضعیف ریش دراز آدمی ایسی مذہبی قوت کی علامت ہے (سورج سر پر آنے کے بعد بھی وہ عبادت میں محو ہے جیسے چھ گھنٹے پہلے تھا، سے یہ اشارہ ملتا ہے) جو کسی کو بادشاہ یا حاکم بنا سکتا ہے، لیکن وہ تصوفی نظریہ کا پروردہ ہے جو قانون قدرت کے مطابق ایسی سلطنت کا خواہاں معلوم ہوتا ہے جس کا حکمراں فرشتے جیسا ہو۔ انصاف پسند اور زندگی کی ایسی لذتوں اور خواہشات سے دور جس سے فرشتانہ خصوصیات مجروح ہوں۔

اس کے سامنے حکومت کے لائق دو نظریات کردار کی صورت میں دوزانوں ہو کر فیصلے کا انتظار کرتے ہیں کہ کس کو یہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ ایک شیر دل نامی جو دراز قد اور اپنی چرب زبانی اور شجاعت سے منزل پانے والا نظریہ جو اپنے غلط یا صحیح فیصلے پر اٹل رہتا ہے۔ دوسرا نظریہ فہم و ادراک والا ہے جو سوچ سمجھ کر فیصلہ لیتا ہے، یار دوست اسے مفکر کہتے ہیں۔ دونوں کے سامنے سکہ اچھالنے سے مراد موقعہ دینا ہے، جسے اپنی طاقت اور جوش کے بل پر پہلا نوجوان

لپک لیتا ہے لیکن منزل تک رسائی کی دشواریوں کے احساس سے اسے یہ موقعہ بے فائدہ (کھوٹا سکہ) معلوم ہوتا ہے لیکن فہم وادراک والا نوجوان یعنی نظریہ اس کے لئے رہنمائی کا کام کرتا ہے۔

"کبھی کبھی برے وقت میں کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔"

شیر دل، مفکر کو ساتھ لئے اور کھوٹے سکہ یعنی موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے جدوجہد کرتا ہے اور اپنے قبیلے کا سردار بن جاتا ہے۔ چوتھا کردار بوڑھا پیشوا جو اونچی خانقاہوں میں بیٹھا ہے، قدیم مقدس نظریات کی علامت ہے، جو غلط پر بھی اٹل رہنے والے نظریہ پر حاوی ہونا چاہتا ہے لیکن کھوٹہ سکہ یعنی موقعہ کو فہم وادراک والا نظریہ کام میں لاتا ہے اور طاقت ور نظریہ سارے نظریات پر حاوی ہو کر بڑے دیوتا یعنی ان مقدس نظریات کا امین بن کر سامنے آتا ہے۔

لیکن اس منصب پر قائم رہنا یعنی مقدس نظریات پر روپ بدل کر قائم رہنا بہت مشکل ہے۔ پانچواں کردار رقاصہ جو مختلف اچھی بری خواہشات کی حصولیابی کا نظریہ ہے، جس کے لئے کسی بھی حد تک جایا جاسکتا ہے، افسانے میں داخل ہوتی ہے، اپنی اداؤں سے طاقتور نظریہ کو لبھاتی ہے۔ طاقتور نظریہ مقدس دیوتا کا چولا اوڑھے ہی اس کے فریب میں آ جاتا ہے۔ مفکر یعنی فہم وادراک والا نظریہ جس کی مدد سے شیر دل یہاں تک پہنچا تھا، اسے تنبیہ کرتا ہے کہ:

"اسے چھوا تو جاسکتا ہے، لیکن چکھا نہیں جاسکتا۔"

مقدس نظریات بھی التجا کرتے ہیں:

"ہمارے آقا! ہمیں ایسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالیے..... جہاں ہمارا صبر جواب دے جائے۔ ہماری عزت ہمیں للکارتی رہے گی.... ہمارے آقا! ہم سے ہماری اولادوں کی قربانی..... مانگئے..... جائدادیں مانگئے، ایمان مانگئے، لیکن ایسا فیصلہ نہ سنایئے جس سے قہر نازل ہو جائے۔"

مفکر اسے یاد دلاتا ہے:

"مانا کہ تم دیوتا بنے ہو، لیکن تم انسان ہو...... ہزاروں خواہشات ہیں تمہاری، لیکن

ایسی خواہش کا اظہار ہی کیا کرنا جو ہمارے ہی وجود کو ڈس لے۔''

لیکن ایک بار صحیح یا غلط فیصلہ لے لینے اور اس پر اٹل رہنے والا اس کی بھی نہیں سنتا اور اس کی دوستی اور رہنمائی سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ شیر دلی کے جوش میں وہ یہ بھی نظر انداز کر جاتا ہے کہ اس مقام پر مفکر کی وجہ سے ہے جس نے کھوٹے سکہ کا وقت پر استعمال کر کے اسے یہ بلندی عطا کی تھی۔ وہ ان روایتوں کی پاسداری کی بات کرتا ہے جو طاقت ور اپنے مفاد کے لئے کسی بھی حد تک جا کر قائم کرتے ہیں، لیکن ایک دیوتا جس کا اس نے چولا اوڑھ رکھا تھا، کے لئے یہ ممکن نہیں۔ طاقت کی اس روایت کو برقرار رکھنے سے مقدس نظریات کے بغاوت کا خطرہ تھا۔ مفکر آگاہ کرتا ہے:

''تلواروں کی نوک کب روایت کو برقرار رکھتی ہے۔ فہم و ادراک یہی کہتا ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے وقت کے تیور پہچان لینے چاہیے.....ورنہ بہتے دریا میں آیا ہوا طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا کے لے جاتا ہے....''

لیکن سب بے سود۔ طاقت ور اپنی طاقت کے نشہ سے سرشار اپنی روایت قائم کرنے کے لئے مقدس روایات کو توڑنا چاہتا ہے، بوڑھے پیشوا کے ہاتھ سے عصا گر جاتا ہے جو رہنمائی کی علامت ہے۔ آخر کار جب وہ چھٹے کردار ''لڑکی'' جو رقاصہ یعنی خواہشات کی انتہائی صورت ہے اور دوسروں پر حکومت کرتی ہے اور ان کو اپنے اوپر قربان کرتی ہے، کو احساس ہوتا ہے کہ وہ خود ملکہ بن کر دوسرے کی طاقت ور کا تاج اپنے سر رکھ کر ایک طرح سے غلام بننے جا رہی ہے تو وہ احتجاج کی وہ صورت اختیار کرتی ہے کہ طاقت ور نظریہ کی اپنی صلاحیت کی اصلیت سامنے آ جاتی ہے۔ مقدس نظریات سمجھ جاتے ہیں کہ یہ دیوتا نہیں عام انسان ہے۔ لڑکی کے دانتوں سے شیر دل کے کٹے ہوئے کان سے اس کے چہرے پر پھیلنے والے سرخ خون کی لکیر بہت معنی خیز فضا قائم کرتی ہے جو افسانے کے اختتام کو فطری بنا دیتی ہے۔

''....لیکن جب کٹے ہوئے کان سے سرخ خون کی لکیر شہنشاہ کے رخسار پر پھیلنے لگی تو بوڑھا پیشوا چیخ پڑا.....

''لوگو! یہ دیوتا نہیں ہے.....تم جیسا ایک معمولی حقیر انسان ہے!''

شہنشاہ نے جب لوگوں کا ہجوم اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بوکھلا اٹھا۔ ملکہ کو ایک

طرف ڈھکیل اس قہر سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگا۔ تو مفکر نے اسے روکا اور کہا:

''اب وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تم وقت کے ہاتھ میں ہو.... لیکن .... وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں رہے گا، ایک حقیقی شہنشاہ کی طرح موت کو لبیک کہو۔''

''وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں رہے گا'' کا معنی یہ ہے کہ اس خطرناک صورت حال میں بھی تم اپنی شناخت یعنی شیر دلی کو برقرار رکھو، بزدل مت بنو۔ اس طرح کم سے کم تمہیں شیر دل کی صورت میں یاد کیا جائے گا۔

وحشی سعید نے اس افسانے میں قیادت کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور اصول وضوابط کے مختلف نظریات کو جس طرح کرداروں کی ہیئت میں پیش کر کے منظر اور مکالمہ جس میں فلسفیانہ عناصر بھی شامل ہیں، سے اسے بنا ہے، وہ ان کی انفرادیت پر دال ہے۔

آدھے ادھورے

جب ہم اپنی سوچوں کو قتل کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارے پاس سوچنے کو کچھ بھی نہیں رہا..... پھر اس سوچ کو کیونکر سوچ مانا جائے، کہ آدھی تصویر بھی دراصل مکمل تصویر ہے۔

تصویر میں پچیس رنگ ہوں پھر بھی نامکمل ہو؟ کیا یہ المیہ نہیں اور صرف آدھی تصویر کا عنوان چپکائے پھرے.... ایک بوجھ ہے۔ اور بوجھ جب پہچان بن جاتا ہے تو ہم اپنی تمام سوچوں کو قتل کر دیے ہیں۔

نجات دہندہ کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دو۔ کیونکہ وہ فولادی ہاتھ بھی ہاتھ نہ تھے۔ اگر وہ مکمل ہوتے تو تصویر میں صرف ایک رنگ ہوتا۔

جب وہ لحاف میں اپنی نامکمل تصویر چھپاتا تو اس کا شعور سو جاتا اور لاشعور جاگ پڑتا۔ اس کو ساری دنیا الٹی نظر آتی جو صرف ایک ہی ٹانگ پر کھڑی ہر آدمی کے اوپر آدھی تصویر چپکاتی معلوم ہوتی اور وہ، صرف وہ مکمل نظر آتا۔

یہ عیب بھی ہے، نقص بھی اور جرم بھی۔ عظیم ہونے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اژدھا دھیرے دھیرے اس کی طرف سرکتا رہا۔ اور وہ بھاگتے بھاگتے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ نوکیلے پتھروں نے اس کو لہولہان کر دیا۔ پیاس شدید تھی اور پانی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ لہو تو بہتے ہی جم جاتا ہے۔

چمار کے بیٹے کو بڑی ہنسی آئی۔ کہ تصویر تو ادھوری ہے۔ یہ ہنسی کب اپنی ذات پہ طنز کرتی نظر آئے۔ کیا معلوم۔ ادھوری تصویر کے پس منظر میں شاہکار کا تصور بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔

کیا یہ سانحہ نہیں، کہ کبھی کبھی مصور کو اپنی بنائی ہوئی تصویر پر شدید غصہ آئے۔ کیونکہ ممکن ہے اس کے تصور سے بھی نامکمل تصویر کے کچھ نازک گوشے چھپے ہوں۔ پس منظر کا شاہکار

سب کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ بہت نزدیک یا بہت دور سے بھی جو نامکمل تصویر کو دیکھے۔ افسوس ہی کا اظہار کرسکتا ہے۔ اور نامکمل تصویر چوٹ کھا کر چکنا چور ہو جاتی ہے۔ بکھر جاتی ہے۔ اور اپنی محرومی میں کسی کو شریک کرنے کی روادار نہیں ہوتی۔ ہونٹوں پر جو مسکراہٹ صدیوں میں ابھرتی ہے، اس کو خود ہی قتل بھی کر دیتی ہے۔

تصویر کے نازک پہلو جب ابھر کر سامنے آتے ہیں تو تعریفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا پل باندھا جاتا ہے۔

آرٹ گیلری سے اژدھا برابر اس کے تعاقب میں تھا۔ اژدہے نے اس کو عجیب سنہرے خوابوں میں مبتلا کیا۔ اور وہ اپنے ادھورے پن کی حقیقت بھلاتا رہا۔ محل بھی تعمیر ہوا۔ خوبصورت باغیچہ بھی ترتیب دیا گیا۔ رنگین پردوں کی سرسراہٹ بھی ہلکی موسیقی میں تحلیل ہوتی گئی۔ خوابوں میں فردوس کی کیفیت بھی سمٹ آئی، لیکن وہ سب کے سب شیشے کے تھے۔ اژدھے کی ایک ہی پھنکار نے منتشر کردیے۔ شیشے چبانے کی آواز دور آرہی تھی۔

اچانک آدھی تصویر میں آنکھیں ابھر آئیں..... آنکھوں سے دو آنسو گرے اور کینواس میں جذب ہو گئے۔

اژدہے کے طلسمی رنگ رات کی سیاہی میں ڈھلنے لگے۔ اور وہ جزیرہ جس میں وہ قید تھا، زندگی سے کٹ گیا۔ وہ دوڑتا رہا..... اور اژدھا اس کے بال و پر نگلتا رہا۔

وہ دھندلکوں میں اپنی پہچان ڈھونڈنے لگا۔ قافلے کو اپنے ساتھ لے جانا یا اپنے ساتھ لے جانے کا حوصلہ پیدا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہ اسے دور تک لے جانا چاہتا تھا۔ بہت دور تک۔ جزیرہ کا جو عکس ابھرتا رہا، ڈوبتا رہا وہ اس کو تختۂ دار پر کند تیغ کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن جس قافلے کا وہ غم گسار رہا۔ جس قافلے کی ایک ایک خوشی کے لیے وہ صدیوں روتا رہا۔ اس قافلے کے ہر فرد نے اژدھے کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس کی ذات کا سب سے بڑا کرب یہ تھا کہ وہ خود بھی اژدھا بنتا جا رہا تھا۔

آرٹ گیلری سے تعاقب کرتا ہوا اژدھا اب بھی برابر پھنکارتا جا رہا تھا!

تجزیہ:

اپنے افسانے ''آدھے ادھورے'' میں وحشی سعید نے دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود ایک ایسی منتشر قوم کے ذہنی وجسمانی عمل کی وہ تصویر کھینچی ہے جو ان کی بدحالی کا سبب ہے لیکن عیش پرستی یا مفاد پرستی یا آرام طلبی کے ساتھ ہی سرخروئی کی خواہش مند ہے۔ان میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو جدوجہد کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن ان بہت کم تعداد والوں یا دو چار کی جدوجہد سے آدھے ادھورے نتائج ہی برآمد ہوتے ہیں جو مسلسل جاری رہنے والے مسائل میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار ''وہ'' اسی ادھورے پن کو آدھی تصویر کا نام دیتا ہے۔نجات دہندہ جو ایک ایسے رہنما کی علامت ہے جو آدھی ادھوری تیاریوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے اور آپسی انتشار کے سبب ناکام ہو جاتا ہے:

''نجات دہندہ کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دو۔کیونکہ وہ فولادی ہاتھ بھی ہاتھ نہ تھے۔ اگر وہ مکمل ہوتے تو تصویر میں صرف ایک رنگ ہوتا۔''

لحاف میں اپنی نامکمل تصویر چھپانے کا مطلب پورے جسم کو چھپانا جس میں دل اور دماغ بھی شامل ہے، یعنی رات میں سونے کا اشاریہ ہے۔شعور کے سونے اور لاشعور کے جاگنے یعنی خود احتسابی کے متلاشی ذہنوں کے تحت الشعور سے ایسے خیالات وارد ہوتے ہیں جو اپنی خامیوں پر شدت سے نظر کرتے ہیں۔اس مرحلے میں ''وہ'' قوم کی غلطیوں اور خود بحیثیت فرد واحد اپنی خامیوں کا بھی اعتراف کرتا ہے تو یہ پوری دنیا اور اس نوعیت کا آدمی جہاں مفاد پرستی اور عیش پرستی کی ہوس میں خود احتسابی کا جذبہ پنپ ہی نہیں پاتا، اسے آدھے ادھورے معلوم ہوتے ہیں۔

''اژدہا'' ان ظالم وجابر قوتوں کے حربوں اور آلات کا استعارہ معلوم ہوتا ہے جو مسلسل استحصال کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو نقصان پہنچاتا رہتا ہے۔چمار کا بیٹا جو ادھوری تصویر پر ہنس پڑا، ایک ایسے نادان یا پچھڑے طبقے کی علامت ہے جو سماج کے بہت نچلے

طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے ہر دور میں خواہ وہ خوشحالی کا ہو یا انتشار کا، یا امن وترقی کا، یکساں پاتا ہے۔ اس طرح اس کا ذہن اس غور وفکر سے عاری ہے کہ ادھورے پن کے بعد مکمل پن یعنی ادھوری تصویر کے پس منظر میں شاہکار کا تصور بھی ہوسکتا ہے یعنی ادھوری جدوجہد کا وجود بھی پوری کامیابی کے ارادے سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ تصویر کے اس نازک پہلو یعنی جدوجہد کے عمل کا یہ باریک نقطہ جس میں آنے والی کامیابی یعنی شاہکار کی امید پوشیدہ ہے، جن ذی شعور یا حساس ذہن یا تھوڑا بہت فہم وادراک رکھنے والوں کو جب سمجھ آجاتا ہے تو چمار کے لڑکے کے ذریعہ کی جانے والی تضحیک ان افراد کی تعریفوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ شاہکار کا تصور جو لوگوں کے ذہنوں کی آرٹ گیلری میں محفوظ ہونے لگتا ہے، اژدہا اس کے بھی تعقب میں ہے۔ اور اپنے عمل سے اس کو مکمل نہیں ہونے دیتا، حالانکہ تکمیلیت کا دھوکہ جو شیشے کے گھر کی مانند ہے۔ اژدہے یعنی جابر قوتوں کے حربوں کے ایک ہی وار سے وہ شیشے کا محل یعنی وہ آدھی ادھوری کاوشیں چکنا چور ہوگئیں اور اژدہے کے اس کے شیشوں کو چبانے کی آوازیں دور دور تک سنائی دیں، یعنی ان آدھی ادھوری کاوشوں کا انجام دور دور تک محسوس کیا گیا۔

''وہ''، جس کی کاوشیں ناکام ہوگئیں تھیں اور جو اپنی نامکمل تصویر لحاف میں چھپاتا رہا تھا، اپنی کاوشوں کی پاداش میں کسی ایسے مقام پر قید کر دیا گیا یا اپنے ہی گھر میں اس طرح نظر بند کر دیا گیا کہ اس کا رابطہ دوسری زندگیوں سے کٹ گیا۔ اور اس سبب ''وہ'' جو خود آدھی تصویر کی صورت بن گیا تھا، اس کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ کیوں کہ جابر قوتوں کے آلات اب اس کی کاوشوں کے پر کترنے لگے تھے۔

''وہ''، جس نے قافلے بمعنی قوم کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اس قافلے کا فرد بھی اب مصیبت کی گھڑی میں اس سے کترانے لگا تھا، جس کے سبب وہ بھی جابر قوتوں کے آلات Tool یعنی اژدہے کی طرح محسوس ہونے لگے تھے۔ انسان اپنے اوپر کتنا ظلم وجبر سہہ سکتا ہے، سب کی ایک حد ہوتی ہے۔ شاید اس کے ضبط کی حد بھی ٹوٹنے لگی تھی اور یہ اس کی زندگی کا سب سے کربناک پہلو تھا۔ لیکن آرٹ گیلری یعنی اس کی کاوشوں کی تھوڑی بہت

کامیابی کے دوران سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے جابر قوتوں کے آلات جو اس پر پوری
طرح قابو پا چکے تھے، اب بھی پھنکار رہے تھے، یعنی برابر اس کی کاوشوں پر نظر رکھے ہوئے
تھے۔

وحشی سعید نے اس افسانے میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ جب قافلہ
سالاروں کے ساتھ قافلے والے ایسا سلوک کریں گے تو قافلہ کبھی اپنی ان خواہشات کی تکمیل
نہیں کر سکتا جس کا وہ خواہاں ہے۔ اس طرح جب تک علم باعمل کے مراحل میں مکمل دشواریاں
سہنے کی طاقت پیدا نہ ہو، کوئی بھی قوم یا ملک جو جابر قوتوں کے ہاتھوں قید ہو، اس دنیا میں اپنی
مرضی کے مطابق ترقی وامن کو صرف خیالوں میں ہی آباد کر سکتے ہیں۔

کرچیوں کا سفر

آپ بھی ایک بھلے آدمی کی طرح ہم سے ہمدردی، محبت اور غم گساری کے ساتھ پیش آنے کی کوشش کریں گے۔ اور ہم آپ کے اس سلوک کے عوض آپ کو شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکانا چاہیں گے۔

وقت کی کرشمہ سازی کو کوئی کیا کرے۔ کہ جس آدمی کو ہم سولی پر لٹکانا چاہتے تھے وہی شہر کے بڑے بازار میں اپنے ہاتھ میں چابک لیے ہماری پیٹھ پر عجیب سے نشانات تراشتا ہوا ہم سے بار بار کہہ رہا تھا کہ نظم کا عنوان تجویز کریں۔

جادوگر کے ہاتھ میں جادوئی چراغ ہو اور آپ اسے پہچان نہ پائیں تو اس میں جادوگر کا کیا قصور ہے۔ ماتم کیجیے اور ہو سکے تو اپنی آنکھوں کو جیب میں رکھ کر دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کیجیے کہ آپ کا وجود ابھی تک جادو میں قید ہے۔

سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ جو شخص شہر کے چوراہے میں شیشے کا چراغ ہاتھ میں لیے پھر رہا ہے اس کو سنگسار کیا جائے۔ کیونکہ سورج اب تک سر پر ہے۔

عقل کے اندھو! تمہاری بصارت کے ساتھ تمہاری قوت گویائی بھی سلب ہو گئی ہے۔ کب تک نظم کو تصویر بنا کے اپنے گلے میں لٹکائے پھرو گے۔ وہ جو تم نے شہر کے چوراہے پر سولی کھڑی کر دی ہے۔ اور بار بار اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ خدا کو پھانسی پر چڑھانا ہے۔ تمہاری کم ظرفی کی دلیل ہے کہ خدا کو اب بھی حق و باطل کے رمز میں مبتلا کر رہے ہو..... کب تک اپنی شخصیت کو کچلتے رہو گے؟ اس آواز کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ برداشت!

اور اگر برداشت سرخ نشان کو نگل جائے تو وہی آدمی جس کو کچلنے اور دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے اور شہر کے بڑے بازار میں شیشے کا چراغ ہاتھ میں لیے چلا جاتا ہے۔

''مجھے پہچان لو، میں وقت کی آواز ہوں، میں تم میں ہوں اور تم مجھ میں ہو۔ نوزائیدہ بچوں کی مقدس روح اپنے اندر رکھتا ہوں۔ میں برف کی نرمی رکھتا ہوں اور شبنم کی نمی بھی، صبح کی خوشبودار ہوا کا پہلا جھونکا میں ہی ہوں۔ میں سورج کی آنچ بھی ہوں۔ اور لو کی تپش بھی، وقت نے میرے سینے میں زہریلے ناگ بھر دیے ہیں۔ اور میں اسی سینے میں اندر سے آنے والے طوفان کو دبائے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنا لو، ورنہ وہ بلائیں جو تم لوگوں سے دور رہی ہیں، تم کو آگھیریں گی۔ کیونکہ میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہاتھ پہ رکھا ہوا چراغ گر کر ٹوٹ جائے۔''

اس کا قہقہہ بہت بھیانک تھا۔

اپنے شہر کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ درویش تھا۔ نہیں..... درویش ہے۔ کل درویش تھا۔ تو آج پیغمبری کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔ کل 'من خدا' بھی کہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ممکن ہے آنے والے دنوں میں وہ صرف فلسفی ہو کر اپنی شناخت کرائے۔ کیونکہ وہ بے رحم اپنی شخصیت کو خود ہی یہ روپ عطا کرتا ہے۔ اور خود ہی اپنی شخصیت کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ لیکن اپنے شہر کے لوگ بڑے معصوم ہیں۔ کہ اس کے ہر بہروپ پر ایمان لاتے ہوئے بھی اپنے احساس کی آسودگی کے لیے اس شخص کو شہر کے چوراہے میں پھانسی پر لٹکانے پر متفق ہو گئے۔ ایسا شاید اس شہر کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ کہ سب لوگ ایک ہی رائے اپنائیں۔

اور جب اس کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو آسمان سے بجلیاں کڑکیں۔ بھیانک طوفان اٹھے..... زمین کا سینہ دہل گیا۔ عمارتیں مسمار ہو گئیں۔ لوگ بہت روئے، خون کے آنسو روئے۔ اور اس آفت ناگہانی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن.....

اس شخص کو وقت کے چرخ نے خدا بنا دیا۔ شاید اسی لیے آج بھی اس چوراہے سے جہاں اسے پھانسی دی گئی تھی، پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ اور انسان کتنا کم ظرف ہے کہ اپنے نفع یا نقصان کے لیے بہروپیے کو خدا کا درجہ بھی دے دیتا ہے۔ اور اپنے چہرے کے اوپر خول چڑھائے رہتا ہے۔ کہ اس کی شناخت ناممکن ہو۔ اور جب ہمارے قریب ہوتا ہے تو اپنی ہمدردی، محبت اور غم گساری کا کچھ اس طرح اظہار کرتا ہے کہ بڑے پیار سے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے اور ہم ہی سے اپنی اس ادا کے لیے داد طلب کرتا ہے۔ اب ہماری ہی کم ظرفی

ہے، کہ ہم اس حرکت کو شفقت کا جامہ پہناتے ہوئے بھی اس سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ اور یہ

دوسری بات ہے کہ آج جو بھی شخص ہم سے ہمدردی یا انکساری سے ملنے کی کوشش کرے، ہم اس
کو پھانسی پر چڑھا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ کل ہی کی تو بات ہے کہ جس شخص کی پرستش میں سالہا
سال بتائے اور اسے خدا کا درجہ دیا۔ آج اس کو قبر سے نکالنا ہے اور شہر کے چوراہے میں سولی پر
لٹکانا ہے، کیونکہ ہمارے پاس نظم آ گئی ہے، عنوان آ گیا ہے، اور ہم نے نظم کو تصویر بنا دیا ہے۔

اور جب اس شخص کو شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکایا جائے گا، تو شیشے کا چراغ
ہمارے ہاتھ میں ہوگا، اور ہم اپنی شخصیت کو ہر لمحے نت نئے روپ عطا کریں گے۔

کیا تم ہمیں پہچان پاؤ گے!!

تجزیہ:

''کرچیوں کا سفر'' وحشی سعید کا ایسا منفرد افسانہ ہے جس میں ایک ایسی قوم کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو اپنوں، بیگانوں سے دھوکہ کھا کھا کر اس قدر برہم ہو چکی ہے کہ اب اسے یہ سب بے معنی لگتا ہے۔ افسانے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''آپ بھی ایک بھلے آدمی کی طرح ہم سے ہمدردی، محبت اور غم گساری کے ساتھ پیش آنے کی کوشش کریں گے۔ اور ہم آپ کے اس سلوک کے عوض آپ کو شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکانا چاہیں گے۔''

''کرچیوں کا سفر'' عنوان بھی بہت معنی خیز ہے۔ شیشے کے ٹوٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کرچیاں کہا جاتا ہے، جن سے نہ کچھ تعمیر کیا جا سکتا ہے، نہ کسی اور قسم کا فائدہ ان سے ملتا ہے بلکہ اس پر سفر کرنے والا ان کی چبھن سے لہولہان ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس قوم کا سفر بھی یعنی گزرنے والے شب و روز بھی کرچیوں کے سفر کی طرح ہی اذیت ناک اور لہو میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ جس پر بھی انہوں نے اعتماد کیا، اس نے انہیں استعمال کیا۔

لیکن ان حالات میں تحیر خیزی کا اضافہ تب ہو جاتا ہے جب اس قوم کو استعمال کرنے والا اب ان کو غلام کی طرح بنا لیتا ہے اور ان سے ''نظم'' کا عنوان یعنی اس نئے غلامانہ نظام کا کوئی ایسا عنوان تجویز کرنے کو کہتا ہے کہ یہ بھی اقتداری نظام کے مراحل کا ایک حصہ لگے، نہ کہ ان پر کیا گیا کوئی نیا ظلم۔

جادوگر کے ہاتھ میں جادو کے چراغ کا ہونا اقتداری طبقے کی ان حکمت عملیوں کی جانب ذہن منتقل کرتا ہے جس سے قوم اس کے سحر میں آجاتی ہے۔ خواب سے بیدار ہونے کے احساس کے باوجود اسے حکمراں کی ساحری اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ جان بوجھ کر بھی خود کو اس جادو میں قید رہنے کو مجبور پاتی ہے۔ لیکن جادو کے چراغ کا سحر کتنی دیر باقی رہتا ہے جب عقل و شعور سورج کی روشنی کی طرح روشن ہو جائے۔ سورج سر پر آنے اور شیشے کا چراغ

ہاتھ میں لینے والے کو سنگسار کرنے کا متنقہ فیصلے کی جانب اشارہ ہے۔

لیکن ایک اہم نقطہ جسے وہ ''درویش'' سمجھتے تھے، اور جو حق وصداقت کی علامت ہے، قوم کو مخاطب کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ:

''عقل کے اندھو! تمہاری بصارت کے ساتھ تمہاری قوت گویائی بھی سلب ہو گئی ہے۔ کب تک نظم کو تصویر بنا کے اپنے گلے میں لٹکائے پھرو گے۔ وہ جو تم نے شہر کے چوراہے پر سولی کھڑی کر دی ہے۔ اور بار بار اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ خدا کو پھانسی پر چڑھانا ہے۔ تمہاری کم ظرفی کی دلیل ہے کہ خدا کو اب بھی حق و باطل کے رمز میں مبتلا کر رہے ہو..... کب تک اپنی شخصیت کو کچلتے رہو گے؟ اس آواز کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ برداشت!''

مندرجہ بالا خطاب میں طنز کے ساتھ قوم کی غیرت کو بھی آئینہ دکھایا گیا ہے کہ جذباتی تخیل کے زیر سایہ کئے جانے والے عمل کی حقیقی دوہرے رویے کے عمل کے سامنے کوئی وقعت نہیں۔ سب سے پہلے دوہرے رویے کو ایک مستحکم رویے کی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ رویہ فطری طور پر تب وجود میں آتا ہے جب برداشت سرخ نشان کو پار کر جائے تو حالات بدل جاتے ہیں لیکن چونکہ فطرت بدلنا بہت مشکل ہے تو مسائل سے نجات کے بعد یا اقتدار حاصل ہونے کے بعد قوم دھیرے دھیرے اپنی عیش پرستی میں پھر ایسے عمل کرنے لگتی ہے جو ان کے مسائل کا باعث تھے۔ درویش پھر تنبیہ کرتا ہے۔

''مجھے پہچان لو، میں وقت کی آواز ہوں، میں تم میں ہوں اور تم مجھ میں ہو۔ نوزائیدہ بچوں کی مقدس روح اپنے اندر رکھتا ہوں۔ میں برف کی نرمی رکھتا ہوں اور شبنم کی نمی بھی، صبح کی خوشبودار ہوا کا پہلا جھونکا میں ہی ہوں۔ میں سورج کی آنچ بھی ہوں۔ اور لو کی تپش بھی، وقت نے میرے سینے میں زہریلے ناگ بھر دیے ہیں۔ اور میں اسی سینے میں اندر سے آنے والے طوفان کو دبائے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنا لو، ورنہ وہ بلائیں جو تم لوگوں سے دور رہی ہیں، تم کو آگھیریں گی۔ کیونکہ میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہاتھ پہ رکھا ہوا چراغ گر کر ٹوٹ جائے۔''

اس کا قہقہہ بہت بھیانک تھا۔''

اس بھیانک قہقہے نے ہی شاید اس کی درویشانہ صفت کو مجروح کر اقتداری آلہ کار یا

خود اقتدار کا خواہش مند ہونے کے شکوک پیدا کیے جیسا کہ اس قوم سے ہمدردی رکھنے والوں

کی آخری منزل اپنی مفاد پرستی اور اقتدار پرستی تھی، یہ خیالات انہیں شکوک کا نتیجہ تھے کہ:

''اپنے شہر کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ درویش تھا۔نہیں..... درویش ہے۔کل درویش تھا۔تو آج پیغمبری کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔کل 'من خدا' بھی کہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ممکن ہے آنے والے دنوں میں وہ صرف فلسفی ہو کر اپنی شناخت کرائے۔کیونکہ وہ بے رحم اپنی شخصیت کو خود ہی یہ روپ عطا کرتا ہے۔اور خود ہی اپنی شخصیت کو کچلتا رہتا ہے۔لیکن اپنے شہر کے لوگ بڑے معصوم ہیں۔کہ اس کے ہر بہروپ پر ایمان لاتے ہوئے بھی اپنے احساس کی آسودگی کے لیے اس شخص کو شہر کے چوراہے میں پھانسی پر لٹکانے پر متفق ہو گئے۔ایسا شاید اس شہر کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔کہ سب لوگ ایک ہی رائے اپنائیں۔''

نتیجتاً اسے بھی قوم نے اپنے عتاب کا شکار بنایا، لیکن وہ سچا درویش تھا، اسی لئے تلخ حقائق کو تلخ لہجے میں بیان کرتا تھا جو قوم کے زخموں پر نمک کی طرح اثر کرتی تھی۔کیوں کہ اس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی، لہٰذا اسے کسی کی پرواہ بھی نہ تھی۔وحشی سعید نے ''روپ بدلنے'' کے معنی کو بھی ذو معنویت عطا کی ہے۔یعنی مثبت اور منفی دونوں سطح پر اسے برتا ہے۔درویش کا روپ بدلنا مثبت ہے اور قوم کا نت نئے روپ بدلنا جیسے ''نظم'' آ گئی ہے یعنی اقتدار میں اس کا بھی کچھ نہ کچھ دخل ہو گیا ہے اور یہ امید ہے کہ شیشے کا چراغ اب اس کے ہاتھ میں ہوگا، ان کے نت نئے روپ بدلنے کو منفی۔کیوں کہ روپ بدلنے کے بعد بھی درویش کی شناخت باقی رہی تھی اور یہاں شناخت کے ختم ہو جانے، یا گم ہو جانے یا اقتدار میں ضم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

وحشی سعید نے ایک مظلوم اور منتشر ذہن قوم جو بعض اوقات جذباتی عمل کے زیر سایہ اپنے سود و زیاں کے احتساب میں بھی چوک جاتی ہو، بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔اس موضوع پر اتنے کامیاب افسانے شاذ و نادر ہی اردو ادب میں دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

اندھا کنواں

آج رات مجھے ایک کنواں کھودنا ہے۔ آگ لگنے والی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں ساری زمین اندھی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کنواں اندھا نہیں ہوگا۔

تھوڑے دنوں پہلے جب میں بس اڈے کے پاس کھڑا تھا۔ ایک چمڑے کا بیگ ایک خوش پوش آدمی کے ہاتھوں میں لٹکا ہوا نظر آیا تھا۔ اس پر ''یو۔ کے'' دو حرف لکھے تھے۔ چمڑا چمکدار تھا۔ بیگ کی بناوٹ نفیس تھی۔ اس کی سرخ ٹائی بار بار ہوا میں جھومتے ہوئے اس کی گردن سے لپٹ جاتی۔

''ایک روپے سے لکھ پتی بن جایئے!'' لاٹری ٹکٹ فروخت کرنے والے کی آواز نے میرے کانوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

کالے چمڑے کا بیگ بار بار میری نظروں کے سامنے آتا۔ وہ بیگ چھوٹا نہیں۔ اچھے خاصے سائز کا تھا۔ اور سوٹ والا اپنے محتاط قدم سڑک پر ڈالتے ہوئے ایک تنگ و تاریک گلی میں گھس گیا۔ اس کے پاؤں میں کچھ کسر تھی۔ وہ بیچ بیچ میں لنگرا کر چل رہا تھا۔

میری لاٹری نکلنے والی تھی!

وہ ایک پان والے کی دکان کے سامنے رک گیا۔ شاید ایک سگریٹ کی ڈبیہ اور ایک ماچس کی ڈبیہ خریدی۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ میرے پاس ایک ادھ جلا سگریٹ تھا، لیکن دیا سلائی نہ تھی۔ اس نے ماچس کی ڈبیہ ہوا میں اچھالی، جیسے اس میں کی بقیہ تیلیاں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ میں ڈبیہ پر قابض ہو گیا۔ اور تڑے مڑے سگریٹ کا دھواں میری نس نس میں خوشبو بھر گیا۔

بھوکے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے!!

کل کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہونا چاہیے، ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر وہ چمڑے کا

بیگ....

میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین پر یقین ہے کہ کل کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں

ہے، ہاں......اگر کوئی دوسرا بھوکا نہیں ہوا۔

وہ آدمی کہاں گیا؟

او......دو چار قدم مجھ سے آگے نکل گیا.....بے وقوف! میری نظر سے دور نہ ہو۔

مجھے تمہارا یہ چمڑے کا بیگ ہلانا بڑا پیارا لگتا ہے۔ ایک آوارہ کتا اس کی ٹانگ سے

لپٹ گیا۔ وہ کتے سے الجھ گیا۔

''کمبخت چھوڑ میرا پیچھا!''

اس کی بھدی آواز رات کی خاموشی میں ابھری۔

اب وہ آوارہ کتا میرے پاس آکر کھڑا ہوا۔ لیکن میرے پاس کیا تھا؟

بے چارا مایوس منہ لے کر چل دیا۔ اس کے پاس چمڑے کا بیگ تھا۔ اور میرے پاس

خالی جیبیں.......!

بار بار مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ تیز رفتار دوڑ لگا کے اس کے ہاتھوں سے چمڑے کا بیگ

چھین لوں۔ اور آناً فاناً غائب ہو جاؤں۔ مگر ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ بے وقوف اس طرح

آگے جا رہا تھا جیسے کوئی خوف اور ڈر نہیں۔ جانے پہچانے راستے اور ماحول.....رات کے مہیب

سناٹے میں بھی وہ بھکاری لڑکا اس گلی کے اختتام پر اپنا راگ الاپ رہا تھا۔

''بابو جی.....ایک پیسہ!''

خوش پوش آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ جیب میں گیا۔

مسکراتے ہوئے اس بھکاری لڑکے سے کہا:

''میری ٹائی چوم لو!''

وہ بھکاری تھا۔ مجبور تھا۔ اس کے پیٹ میں میری طرح چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس

نے ٹائی چوم لی۔ خوش پوش آدمی نے اس کے ہاتھ پر ایک چونی رکھ دی۔ وہ لڑکا دوڑتے ہوئے

ایک گلی میں چلا گیا۔ اب ہم دونوں ایک تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوئے۔ وہاں اندھیرا تھا۔

اتنا اندھیرا کہ آدمی اپنے آپ کو کھویا ہوا محسوس کرے۔

وہ آگے تھا! میں پیچھے تھا!!

پھر اچانک میرے پاؤں کے نیچے کچھ آ گیا۔

وہ ایک پتھر تھا۔ دوسرے لمحے اس آدمی کے پھسلنے کی آواز آئی۔ نہ جانے میرے ہاتھوں میں وہ پتھر کب اور کیسے آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی سنبھل پاتا...... میں دوڑتے ہوئے اس کے سر کے اوپر پہنچ گیا..... دوسرے ہی لمحے اس کے سر پر پوری قوت سے وہ پتھر مارا۔ اس کی چیخ بھی منھ سے نہ نکل پائی میں نے خاموشی سے اس کی لاش اپنے کندھے پر رکھ لی اور ایک ہاتھ سے چمڑے کا بیگ سنبھال لیا۔

میرا تمام بدن پسینے سے تر بتر تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کو پار کرتے ہوئے میں وہاں پہنچ گیا۔ جو میری منزل تھی..... دریا کا خوفناک شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ میں ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور پھر اس لاش کو پوری قوت سے دریا میں پھینک دیا..... لاش پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دوڑتے ہوئے ایک سرکاری بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچ گیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بیگ کے بٹن کھولنے لگا..... بٹن کھلتے ہی میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا.....

وہاں ہرے ہرے نوٹ نہیں تھے..... صرف کاغذ کا ایک ورق تھا۔ شاید ڈرافٹ یا چیک ہو، اس خیال کے تحت میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ورق کھولا..... وہاں بڑے بڑے حروف میں صرف چند الفاظ تحریر تھے......

''آج کی رات اس شہر کو آگ لگ جائے گی۔''

اب مجھے ایک کنواں کھودنا ہے۔ میں جانتا ہوں، ساری زمین اندھی ہے۔ مگر مجھے اعتماد ہے وہ کنواں اندھا نہیں ہوگا۔

تجزیہ:

''اندھا کنواں'' ایک ایسی جائے پناہ کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے جہاں ظاہر ہے کہ بہت اندھیرا ہوگا، لیکن وہ اس روشنی سے بہت بہتر ہے جو آگ لگنے سے روشن ہوتی ہے۔ وحشی سعید کے اس افسانے کا موضوع ایسی بڑی طاقتوں کی کارکردگی ہے جو کمزوروں کو چاہے وہ کسی ملک کی شکل میں ہوں یا قوم کی آئینہ داری کی ہے کہ، بظاہر ان کے فائدے میں بھی اس سے کئی گنا فائدہ ان کو فائدہ پہنچانے والوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح قوم کا اس فائدے کے بدلے میں کئی گنا نقصان ہو جاتا ہے۔

مرکزی کردار ''میں'' ایسی کمزور طاقت کی علامت ہے جو مفلوق الحال ہے اور اس کی بھوک اس کی ضرورت مندی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ وہ خوش پوش آدمی جس کے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ ہے اور اس پر ''یو۔ کے'' لکھا ہوا ہے، طاقتور قوت کی علامت ہے۔ اس کا بیگ اس کی ان پالسیوں کی علامت ہے جس سے وہ کمزور کو فائدہ پہنچا کر اپنے لئے کئی گنا فائدے کا انتظام کرتا ہے۔ بیگ کی نفیس بناوٹ اور اس کی سرخ ٹائی اس کی خوشحالی کی جانب اشارہ ہے۔

لاٹری کا ٹکٹ اس مفلوک الحال معاشرے کا اشاریہ ہے جہاں مفلسی کے سبب جوا، لاٹری اور دوسری برائیاں عام ہیں۔ ''وہ'' کی نظر اس کالے بیگ پر ہے جس کا پورا فائدہ وہ خود اٹھانا چاہتا ہے وہ بھی خوش پوش آدمی کو دھوکہ دے کر۔ اس آدمی کا ایک سگریٹ جلانے کے لئے پوری ماچس خریدنا اور اپنا سگریٹ سلگا کر ماچس پھینک دینا اور اس پر ''وہ'' کا قابض ہو جانا کمزور ملک وقوم کی اذیت ناک صورت حال کا مظاہرہ کرتا ہے۔

بھوکے پیٹ میں چوہے دوڑنا اور اس سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہونا لوٹ پاٹ کے عمل کی جانب ذہن کو متوجہ کرتا ہے جو کہ ملک وقوم کی بدحالی کو مزید نمایاں کرتا ہے۔ اس بدحالی کا بیان مزید کربناک وحشی سعید اپنے اس جملے سے بنا دیتے ہیں جو وہ مرکزی کردار ''وہ'' کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ:

''میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں......اگر کوئی دوسرا بھوکا نہیں ہوا۔''

یہ جو کوئی دوسرا جس کے بھوکا ہونے سے ہنگامہ ممکن ہے۔ یہ کوئی دوسرا فرد بھی ہوسکتا ہے، دوسری قوم بھی اور دوسرا ملک بھی جو اسی طرح اس بیگ کا محتاج ہے جس طرح ''وہ'' کا علامتی کردار۔

خوش پوش آدمی کا سڑک بمعنی صاف شاہراہ چھوڑ کر تنگ و تاریک گلی سے گزرنا اس کی بداعمالیوں کا استعارہ ہے، وہ گلی جس میں ایک آوارہ کتا جو کسی بدحال کمزور کی علامت ہے، اس سے چمڑے کا بیگ، چمڑا جو کہ کتے کی خوراک ہے، کے لئے اس کی ٹانگ سے لپٹ جانا یعنی فریاد کرنا اور اس آدمی کا اسے جھڑک دینا بھی شدید کرب میں اضافہ کرتا ہے۔ آوارہ کتے کا ''وہ'' کے پاس جا کر کھڑا ہو جانا یہ بھی باور کراتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

گلی کے اختتام پر اس آدمی سے ملنے والا بھکاری لڑکا ایسے فرد یا ملک وقوم کی علامت بن جاتا ہے، جس کی حالت شاید بدترین درجے کی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ ''ایک پیسہ'' اس کی محدود ضرورت کا استعارہ ہے، لیکن اس کے لئے بھی اس آدمی کا یہ کہنا کہ میری ٹائی چوم لو یعنی میرے غلام بن جاؤ اور اس بھکاری کا ایسا کرنا اور اس پر ایک پیسے کی جگہ بھکاری کو چونی دے دینا اور اس لڑکے کا دوڑتے ہوئے دوسری گلی میں چلے جانا بھی اپنی ایک کہانی رکھتا ہے۔

آدمی کا مزید تنگ و تاریک گلی میں داخل ہونا، اس کا لنگڑا کر چلنا، پھسل کر گرنا اور اس کا فائدہ اٹھا کر ''وہ'' کا اس کا بیگ لے کر بھاگ جانا اس آدمی کی خراب نیت کے نتیجے کی علامت ہے۔ ''وہ'' کا اس پر قابو پا کر پتھروں سے کچل کر دریا برد کرنا کمزور کی بظاہر طاقت ور کی پالسیوں کا پورا فائدہ خود حاصل کرنے کی ایک کوشش سے عبارت ہے۔ لیکن چمڑے کا بیگ کھلنے پر نوٹ نہ ہونا یعنی اس کے فائدے کی چیز نہ ہونا ہے، شاید ڈرافٹ یا چیک کا ہونا طاقتور فرد یا ملک وقوم کی ذہانت اور چالاکی کا استعارہ بن جاتا ہے کہ جس کو وہ فائدہ پہنچانا چاہیں وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، چھین جھپٹ، لوٹ مار یا وقتی کمزور کر کے اس پر حاوی ہو کر بھی وہ فائدے کمزور کے لئے بے معنی ہیں۔ لیکن وہ کاغذ جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہے کہ ''آج کی رات اس شہر کو آگ لگ جائے گی''، ان کی پالسیوں یا فائدے جو کہ چیک یا ڈرافٹ کی صورت میں

تھے،کی اصلیت کواجاگر دیتے ہیں کہ شہر کہ اس فائدے میں بھی شہر کا کتنا نقصان ہے۔''وہ''

جو کمزور فرد طبقے ،ملک یا قوم کی علامت ہے،اس روشنی جس میں ساری زمین بہ معنی ساری دنیا
جس کی چکا چوندھ میں اندھی ہو چکی ہے،سے بہتر اس اندھے کنوے بہ معنی اس روشنی کی بہ
نسبت اس اندھیرے کو سمجھتا ہے جس کی تعمیر اسے خود کرنی ہے۔جو ہوس اور مفاد پرستی کی چکا
چوندھ روشنی کی طرح ساری دنیا کو اندھا کر دینے والا نہیں ہوگا۔

کہانی کا آسیب

پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔

میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپالیا۔ کیونکہ آئینے نے پہچاننے سے انکار کیا تھا۔

کہیں یہ کہانی کا آسیب تو نہیں۔

زندگی کے طویل سفر میں اچانک ایک روز عمرو عیار سے ملاقات ہوئی۔ انڈین کلاسیکس کے مرکزی کردار سے ہزار باتیں ہوئیں، لیکن کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اگر یاد رہا تو صرف اتنا کہ ایک روز ایک بادشاہ اپنے کمرے کی دھند میں غائب ہوگیا، اور چلاتا رہا، میں کہاں ہوں، مجھے تلاش کرو۔ میں نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا:

کہیں یہ کہانی کا آسیب تو نہیں۔

اس کے میک اپ شدہ چہرے پر میں کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ اور اپنی زنبیل سے اس نے گلیم نکالی۔ میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھا اور گلیم اوڑھ لی۔

میرے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ تھا۔

شاید وہ کتاب کا اٹھارواں صفحہ رہا ہوگا۔ لڑکی کے حسن کے سامنے الف لیلوی شہزادیوں کی نفاست اور حسن ماند پڑتی تھی۔ لیکن لڑکی زندگی میں آرام و آسائش میسر نہیں تھی۔ کہ وہ خود کو شہزادیوں میں شمار کرے۔ لڑکی فلک بوس عمارتوں میں نرم گدیلوں پر سونے، امپالا گاڑی میں گھومنے، ایئر انڈیا کے جہازوں میں اڑان بھر کر سوئٹزرلینڈ کی وادیوں میں سیر کرنے، قیمتی ملبوسات استعمال کرنے، زندگی کے بارے میں مفکروں کی طرح سوچنے کے خواب دیکھ سکتی تھی۔

لیکن خواب..... خواب حقیقت میں بدل جائیں گے یہ بھی اس کو یقین تھا۔ اس لیے ایک دن جب لڑکے نے اس سے کہا:

''آؤ ہم دو ایک ہو جائیں''

تو لڑکی نے طنزیہ انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا:

''دو کو دو ہی رہنے دو۔ ہو سکے تو چھت کی مرمت کرالو، ورنہ اب کے ساون کی بارشوں میں مکان بہہ جائے گا۔''

اور کتاب کے ۲۵ ویں صفحے پر لکھا تھا:

بہت زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ایک لڑکی بس اسٹینڈ پر آدھے گھنٹے سے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے رومال کا پنکھا بنا کر اپنے منہ کے سامنے کر کے شاید گرمی کا احساس کم کر رہی تھی۔ اتنے میں شہر کی واحد رولس رائیس گاڑی وہاں آ کر رک گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور لڑکی بڑی عجلت میں دعوت ملے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شاید اس کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی دوسری لڑکی گاڑی میں نہ بیٹھ جائے۔ گاڑی چل پڑی۔

''تو ہم دو سے ایک ہو جائیں گے۔'' لڑکی نے کہا۔

''یہ غلط فہمی کیوں کر.....'' لڑکے کا لہجہ تیز تھا نہ دھیما۔

''گاڑی جو آپ نے میرے لے کھڑی کر دی۔'' لڑکی کی آواز میں اعتماد تھا۔

گاڑی رک گئی۔

''آپ کا مکان آ گیا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''آیئے اندر آیئے۔'' لڑکی نے دعوت دی۔

''لگتا ہے اب کے ساون کی بارشوں میں مکان بہہ جائے گا۔ میں کیسے مکان میں آ سکتا ہوں۔'' لڑکا دھیمی آواز سے بولا۔

لڑکی خاموش تھی۔ لڑکے نے قہقہہ بکھیرتے ہوئے کہا:

''یہ لو! تین ہزار روپے اور چھت کی مرمت کروالو۔'' اور زن سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔

لڑکی نے ایک نظر آسمان کی طرف، ایک مکان کی طرف اور ایک نوٹوں کی طرف ڈالی۔

الہ دین کے چراغ سے ایک خط برآمد ہوا۔ لکھا تھا:

''دوسروں کے مرنے پر افسوس وہ کرے جس کو خود مرنا نہ ہو۔ اور جو خود پل پل مرے، اور پل پل مرنے کے بعد زندہ ہو، اور اپنی نئی زندگی میں اپنی پچھلی موت پر افسوس کرے، وہ فریب آگہی میں مبتلا ہے۔ ہمارے پاس کیا کچھ نہیں۔ کیا یہ بھی ایک سانحہ نہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں، ہم تو پرزے ہیں، چھوٹے چھوٹے پرزے۔ مشین پر کون بیٹھتا ہے، کیا کبھی معلوم ہو سکا۔''

کتاب؟

الہ دین کا چراغ؟

چراغ سے برآمد ہونے والا خط؟

اور عمر و عیار؟

کہیں یہ سب کچھ کہانی کا آسیب تو نہیں؟

عمر و عیار مجھ پر جھپٹ کیوں پڑا؟

کیوں؟

میرے ہاتھ خالی کیوں ہیں؟

میں سڑک کے اگلے موڑ پر تنہا کیوں کھڑا ہوں؟

کیا میری کوئی انفرادیت نہیں؟

کوئی وجود نہیں؟

کیا میں مشین کا پرزہ ہی ہوں، جو گھس جائے تو پھینک دیا جائے گا۔

کیا میرا کردار ہی میرا المیہ ہے؟

میری پہچان کیوں نہیں؟ کیا اس لیے کہ میں بھی بھیڑ میں سے ایک ہوں؟

پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔

میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔

کیوں کہ

آئینے نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا!!

تجزیہ:

''کہانی کا اسیب'' کہانی کے مختلف ادوار کو بیان کرتا ایک ایسا علامتی افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار ''میں'' افسانے کے اختتام جس میں انسان کے وجود کے روز اول سے اب تک کی ایک آفاقی حقیقت کا اظہار ہے، وہ یہ کہ ہر دور میں خواہ وہ کہانی کا ہو یا حقیقی زندگی کا۔اور غور کیا جائے تو حقیقی زندگی بھی ایک طرح سے حقیقی کہانی ہی ہے جس سے وہ مصنوعی اور تخیلاتی کہانیاں جنم لیتی ہیں جن کا کوئی نہ کوئی ربط حقیقی کہانی یعنی زندگی سے ضرور ہوتا ہے۔افسانے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔

میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپالیا۔ کیونکہ آئینے نے پہچاننے سے انکار کیا تھا۔

کہیں یہ کہانی کا آسیب تو نہیں۔''

ظاہر ہے کہ یہ کہانی کا آسیب ہی ہے جس کے اثر سے ''میں''، یعنی فکشن تخلیق کار جس کا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا، یعنی نئی یا منفرد شکل اختیار کر گیا جس سے آئینے یعنی زمانے کی مروجہ روایت نے یا پھر عام قاری نے اسے یعنی اس کے تخلیق کردہ فکشن کو پہچاننے سے انکار کر دیا، جس کے وجود کی ابتداء کہانی کے وجود کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔وہ ''میں'' کو کہانی کی اول تا حال تاریخ کے از سر نو مطالعے اور غور وفکر کے لئے مجبور کرتا ہے۔

کہانی کی ابتداء کے صفحات پر انڈین کلاسیکس دور کے اہم داستانوی کردار عمرو عیار کا مطالعہ کرتے ہوئے (انڈین کلاسیکس کے مرکزی کردار سے ہزار باتیں ہوئیں، لیکن کچھ بھی پلے نہیں پڑا) کچھ بھی سمجھ میں نہ آنا یہ باور کراتا ہے کہ اب اس قسم کے فکشن ادب کو سمجھنے والے نہیں رہے۔جس طرح ایک روز ایک بادشاہ کمرے کی دھند میں غائب ہو گیا اور چلاتا رہا، میں کہاں ہوں، مجھے تلاش کرو، یہ اشارہ وحشی سعید کی افسانے میں شامل تنقیدی حس کا بھی بین

ثبوت ہے۔اس دور کے فکشن ادب کے تحفظ کے سلسلے میں آج کے نئے آلات اور مروجہ الفاظ کے ذریعہ داستانوی ادب کو آسان اور دلچسپ زبان میں از سر نو تحریر کر کے اور اس کے دنیا کی مقبول زبانوں میں تراجم پیش کر کے ہی ہم دور حاضر میں اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کر سکتے ہیں اور ساری دنیا میں اسے منوا بھی سکتے ہیں۔

کتاب کا اٹھارہواں صفحہ یہاں اٹھارویں صدی کی ترقی یافتہ زندگی کی علامت ہے جہاں میک اپ شدہ لڑکیاں الف لیلوی شہزادیوں سے بھی حسین لگتی ہیں۔اسی دور کی ایک میک اپ شدہ چہرے کا ''میں'' کو اپنی زنبیل میں سے گلیم نکال کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھ کر اوڑھ لینا اور اس سے ''میں'' کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ کا آجانا دلالت کرتا ہے کہ اس دور میں وہ سب حاصل ہوسکتا ہے جس کے لئے کبھی الہ دین کے چراغ کی ضرورت تھی۔

اس نئی میک اپ شدہ شہزادی کے خواب بھی مختلف ہیں۔اب کسی ریاست کی شہزادی بننا اس کا خواب نہیں ہے بلکہ ایک ایسی عیش پرست ترقی یافتہ زندگی گزارنا ہے جو ترقی یافتہ شہر میں فلک بوس عمارتوں کے شاندار اپارٹمنٹس اور امپالا گاڑی میں گھومنے، ہوائی جہاز سے دوسرے ملکوں کی سیر کرنے والوں کا مقدر ہے۔

اٹھارہویں صدی کے بعد حسن و عشق کے موضوعات میں ایک اور اضافہ ہوا جس میں عاشق مفلس ہوتا ہے یا معشوق اور مفلس کو اس کا محبوب اس کی مفلسی کے باعث چھوڑ دیتا ہے۔تقدیر بدلتی ہے اور مفلس عاشق یا معشوق اپنے محبوب سے امیر ترین ہو کر واپس آتا ہے اور اپنے محبوب کو اسی طرح اپنی امیری کا احساس دلا کر چھوڑ دیتا ہے یا اپنا لیتا ہے۔ضمنی واقعے کے طور پر وحشی سعید نے اس کو بھی برتا ہے۔اس طرح انتشار کی جو کیفیت حقیقی اور مجازی کہانی کے روز اول سے تھی، وہی اب تک ہے۔

وحشی سعید نے اس افسانے میں شعور کی رو کا استعمال بھی بہت عمدہ کیا ہے۔الہ دین کے چراغ سے جو خط برآمد ہوتا ہے، اس میں غالبؔ کے ایک خط کے جملے جہاں ماضی کو حال سے منسلک کر دیتے ہیں، وہیں الہ دین کے چراغ جواب تک خواہشوں کی تکمیل کی علامت تھا، دور حاضر میں اپنی معنویت بدل کر صبر و ضبط کی تلقین کرتا ہوا اور سب کچھ کسی دوسری قوت کے ہاتھ میں ہونے کا اعتراف کرتا ہوا سامنے آتا ہے:

"دوسروں کے مرنے پر افسوس وہ کرے جس کو خود مرنا نہ ہو۔ اور جو خود پل پل مرے، اور پل پل مرنے کے بعد زندہ ہو، اور اپنی نئی زندگی میں اپنی پچھلی موت پر افسوس کرے، وہ فریب آگہی میں مبتلا ہے۔ ہمارے پاس کیا کچھ نہیں۔ کیا یہ بھی ایک سانحہ نہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں، ہم تو پرزے ہیں، چھوٹے چھوٹے پرزے۔ مشین پر کون بیٹھتا ہے، کیا کبھی معلوم ہو سکا۔"

دوسرے کے مرنے پر افسوس یہاں خواہشات کی موت سے بھی دلالت کرتا اور موجودہ زندگی کی نوعیت پر بھی۔ ہمارا مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزے ہونا اور اور مشین پر کسی اور کا بیٹھے ہونا جہاں حقیقی طور پر خالق کائنات کی مکمل قوت کا اظہاریہ ہے وہیں مجازی طور پر آج پوری دنیا پر قابض جابر قوتوں کی جانب بھی ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ "ہم" ایک یا ایک سے زیادہ افراد سے آگے پوری دنیا کی مظلوم قوم وملک کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانہ آخری سطروں میں شعور کی رو تکنیک کے استعمال کے ساتھ ماضی اور حال کے سفر سے ہوتا ہوا افسانوی ادب کے اول دن سے بدلتے دور کے بدلتے موضوعات کو احاطے میں لاتا ہے اور مستقبل کے بعض اہم سوالوں کی نشاندہی کر کے اس طور ختم ختم ہوتا ہے کہ وحشی سعید کی منفرد فن کاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

"کتاب؟ (فکشن کے پہلے دور میں موضوعات کے طور پر بیان ہونے والے مقدس واقعات)

الہ دین کا چراغ؟ (داستانوں کے عروجی دور کا ایک موضوع)

چراغ سے برآمد ہونے والا خط؟ (فکشن کے اس دور سے آگے نکلنے کا اشاریہ)

اور عمر وعیار؟ (داستانوں کے عروج کے دور کا ایک اہم کردار)

کہیں یہ سب کچھ کہانی کا آسیب تو نہیں؟ (زندگی کے انتشار کے بیانیہ میں اسلوب کی تبدیلی کا اشاریہ)

عمر وعیار مجھ پر جھپٹ کیوں پڑا؟ (اسلوبیاتی اور موضوعاتی تبدیلی کا پختہ عملی ثبوت)

کیوں؟ (ترقی پسند فکشن، پریم چندیات کے عقب سے پوشیدہ سوال کہ ایک خاص طبقے (جس کو اردو والے مظلوم اور مفلس طبقہ کہتے ہیں اور ہندی والے دلت ذات سے منسلک

کر کے دلت ادب کی الگ تاریخ مرتب کرتے ہیں) پر ہی ظلم کیوں؟
میرے ہاتھ خالی کیوں ہیں؟ (ترقی پسند نظریات کے زوال کا اشاریہ)
میں سڑک کے اگلے موڑ پر تنہا کیوں کھڑا ہوں؟ (جدیدیت کا آغاز)
کیا میری کوئی انفرادیت نہیں؟ (جدیدیت کا اہم موضوع)
کوئی وجود نہیں؟ (جدیدیت کا اہم موضوع جو احساس شکست کی دین ہے)
کیا میں مشین کا پرزہ ہی ہوں، جو گھس جائے تو پھینک دیا جائے گا۔ (کشمکش)
کیا میرا کردار ہی میرا المیہ ہے؟ (انسان کے داخل اور کارج کا انتشار)
میری پہچان کیوں نہیں؟ کیا اس لیے کہ میں بھی بھیڑ میں سے ایک ہوں؟ (جدید)
پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔
میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپالیا۔
کیوں کہ
آئینے نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا!!"

بت پرست

برش نے بے ترتیبی سے کاغذ پر رنگ پھیلانا شروع کیا۔ اس بے ترتیبی میں انوکھی شکلیں کاغذ پر ابھرنے لگیں۔ وہ سب میرے پیچھے دوڑتی رہیں۔ اور میں بھاگتا رہا۔ لیکن اس دوڑ میں بھی وہ آواز میرا تعاقب کرنے لگی۔

''رضو! ذرا بازار سے کچے آم لانا۔''

میں خود سے الجھ گیا اور جھنجھلاہٹ میں چیخ پڑا۔

''فری! میری لکیریں درست نہیں ہو پاتیں!''

''بے وقوف! لکیروں میں نہ الجھ..... آم لا..... آم لا.....''

کوئی جب رنگوں کی دنیا میں الجھ جائے تو اس الجھن میں سیاہ رنگوں کا ڈھونڈ نکالنا دل گردے کا کام ہے۔ لیکن جب اپنا ہی ہوش بغاوت کرنے پر تلا ہوا ہو..... پھر آدمی ایک تماشائی بن کر رہ جاتا ہے..... میرا برش صرف سرخ رنگ میں ڈوبتا رہا۔ میں بھاگتا رہا لیکن سرخ رنگ سے فرار ناممکن تھا۔

ایسے میں ایک آواز بہت دور سے آئی۔

''رضو! میں جا رہی ہوں..... رونا نہیں!''

میں تو بس ان ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو سرخ رنگ میں رنگے گئے تھے۔

''فری! تمہارے ہاتھ کیسے خون میں رنگ گئے؟''

وہ مجھے سینے سے لگائے بہت زور زور سے رونے لگی۔

''رضو! میں نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنا خون کیا!''

میں پریشان ہو اٹھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''لیکن فری! آج تو میں نے سات لکیریں ترتیب سے کھینچی!''

''پگلے!'' فری نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔

''اب سات سے بات نہیں بننے والی ہے بیس ہونی چاہیے بیس!

میں آواز کی دنیا میں کھو کے رہ گیا۔ بیس کی گردان کرتا رہا۔ فری کی وہ آواز سوز میں ڈوبی ہوئی تھی، میری تلاش کا موضوع بن گئی..... ہاں.....ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا تھا کہ یہ تلاش کیوں اور کس لیے.....اور پھر جب ایسے موقعوں پر خود سے بھی خوف کھانے لگتا۔ تو اپنے برش کی پناہ میں آجاتا..... برش آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے کسی کے پیچ وخم میں الجھ جاتا..... یہ آنکھ مچولی بھی دل لگی کا موجب بن گئی۔

وہ کہنے لگی.....

''رضو.....میرے.....قریب آؤ۔''

''.......فری.......یہیں کہیں کسی کونے میں چھپی ہوئی ہے۔''

وہ بالآخر چیخ پڑی۔

''فری!.......فری! کب تک!''

یہ سوال میں خود سے بھی بہت دنوں کرتا رہا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ پا سکا۔ میں صحرا صحرا بھٹکتا رہا.....پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ احساس کانٹے کی طرح چبھتا رہا.....میرے پاؤں زخمی ہوگئے تھے۔ میں تھک کر چور چور ہوگیا تھا۔

اب تو میں نے اپنے ارادوں میں سنگ کی مضبوطی بخش دی۔ میں فری کے بنے ہوئے جال سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ یہ میری جرأت کی انتہا تھی۔

پھر ایک دن تصویر بن کر میری تصویر کا ذکر کچھ یوں کرنے لگی جیسے مجھ کو مجھ سے روشناس کرا رہی ہو۔ اس تصویر کی عبارت کچھ یوں تھی.....کہ مجنوں لیلیٰ کی تلاش میں تھکا ہارا صحرا کے بیچ میں کھڑا اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا.....جھریاں گن رہا تھا!

وہ کہنے لگی:

''حقیقت نگاری کے ایسے نادر نمونے بہت کم ملتے ہیں.....!''

میں نے پاس آکر کہا:

''لیکن ایسے لمحے کو قید کرنے کے لیے بہت لمبا سفر طے کرکے آیا ہوں۔''

''تھک گئے ہو کیا؟''

''تھک گیا ہوں......لیکن ایک نئی امنگ کی تلاش میں ہوں۔''

جانے کیوں پہلی بار میں الفاظ پر گرفت نہیں پا رہا تھا.....جیسے کچھ کہتے کہتے کچھ اور کہہ جاتا.....بس میں تو صرف پکارتا رہا.....

''منی!.....منی.....!!''

میں خود سوچتا رہا۔ اور خود ہی اپنی سوچ کو ترتیب دیتا رہا۔ لیکن منی میری تصویروں میں خود کو چھپاتی رہی۔

اس دن اس نے ڈوبتے ہوئے سورج کی منظر کشی کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا ہر پہلو لاجواب ہے.....حضور! میں آپ کے فن کے ہر پہلو سے بہت متاثر ہوئی ہوں.....مجھ ناچیز کی طرف سے یہ تحفہ قبول کیجیے۔''

میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ میں صندل کا عصا تھما دیا۔ پھر وہ فری جس کو منوں مٹی کے نیچے سلا کے آیا تھا.....میرے کانوں میں آ کر کہنے لگی:

''رضو......ذرا بازار سے کچے آم لا!!!!''

تجزیہ:

''بت پرست'' وحشی سعید کا ایسا افسانہ ہے جس کا موضوع آزادی کی چاہت رکھنے والی خواہشات سے ہے۔ یہ آزادی اپنی ان خواہشات سے آزادی کا اشاریہ ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے دور کرتا ہے، لیکن وہ جذبہ کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہوتا رہتا ہے جیسا کہ اس افسانے کا اختتام ہمیں بتاتا ہے کہ:

''میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ میں صندل کا عصا تھما دیا۔ پھر وہ فری جس کو منوں مٹی کے نیچے سلا کے آیا تھا...... میرے کانوں میں آکر کہنے لگی:

''رضو...... ذرا بازار سے کچے آم لا!!!!''

افسانے کا عنوان ''بت پرست'' بھی افسانے کے مرکزی واقعہ سے بہت مناسبت رکھتا ہے کہ منفی کوششوں سے اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے تگ و دو کرنا ویسا ہی ہے جیسے ایک بت پرست کا بت کو خدا مان کر اس کی عبادت کرنا۔ افسانے کا مرکزی کردار ''میں'' اسی حقیقی آزادی جس کو وہ تخیل میں ''فری'' کا نام دیتا ہے، تصورات کی دنیا میں اسے ایک ہیئت عطا کرتا ہے اور زبان بھی دیتا ہے۔ برش کا بے ترتیبی سے کاغذ پر رنگ پھیلانا ان بے ترتیب کاوشوں کا استعارہ ہے جن سے انوکھے نتائج یعنی انوکھی شکلیں برآمد ہوتی ہیں اور اپنے اس بگاڑ کے لئے اس معمار کا تعاقب کرتی ہیں جس کی کاوش نے ان کو یہ ہیئت عطا کی ہے۔ ''وہ'' ان سے دامن چھڑانا چاہتا ہے جو اس کی بت پرستی کے عمل کی طرح کی ایسی دلیل ہے کہ وہ اب بھی اس حالت کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، حالانکہ اسے احساس ہے کہ اس الجھاوے کا کوئی سلسلہ اس تک بھی پہنچتا ہے لیکن محسوس کرنے اور ذمہ داری قبول کرنے میں جو فرق ہے، وہی اس کے انتشار کا سبب ہے۔ ''فری'' اس کی طفلانہ جیسی کاوشوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے ''کچے آم'' لانے یعنی روزمرہ کی ایسے کام میں صرف کرنے کو کہتی ہے جو کوئی بھی عام فرد کر سکتا ہے۔ جس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جب تک پختگی کے مراحل طے نہ ہو جائیں، یہ الجھاوے

بنے رہیں گے۔

''فری! میری لکیریں درست نہیں ہو پاتیں!''

''بے وقوف! لکیروں میں نہ الجھ.....آم لا.....آم لا.....''

لیکن جب اپنا ہوش بغاوت کرے تو اس قسم کی کاوشوں کو روکنا مشکل ہے، جس کے نتیجہ میں بے وجہ کی خوں ریزی جس کی ایک علامت سرخ رنگ ہے۔ اس طرح ان مقاصد کے حصول کی عملی صورت نہیں بن پاتی لہذا ''فری'' کو کہنا پڑتا ہے۔

''رضو! میں جا رہی ہوں.....رونا نہیں!''

میں تو بس ان ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو سرخ رنگ میں رنگے گئے تھے۔

''فری! تمہارے ہاتھ کیسے خون میں رنگ گئے؟''

وہ مجھے سینے سے لگائے بہت زور زور سے رونے لگی۔

''رضو! میں نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنا خون کیا!''

یعنی شاید میرے اندر اتنی قوت نہ تھی کہ تمہارے جنون کو روک سکوں جس کے نتیجے میں سرخ رنگ تقدیر بنے۔ اس طرح میں خود کو اس کا ذمہ دار مانتی ہوں۔

میں پریشان ہو اٹھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''لیکن فری! آج تو میں نے سات لکیریں ترتیب سے کھینچی!''

''پگلے!'' فری نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔

''اب سات سے بات نہیں بننے والی ہے۔ بیس ہونی چاہیے بیس!''

''بیس'' پر زور یہاں باور کراتا ہے کہ اب ''انیس'' تک یعنی ذرا سا بھی غفلت یا کمزوری سے بات بننے والی نہیں۔ مرکزی کرادر مقصد کی کامیابی میں زمین آسمان ایک کر دیتا ہے، لیکن درمیان میں اصل مقصد سے بہکا دینے والی کامیابی کے مراحل بھی آتے ہیں جو الجھاتے ہیں لیکن اصل مقصد تک رسائی کی جدوجہد جاری رہتی ہے، جس سے بہکا دینے والے مراحل بھی جو بظاہر عافیت بخش ہیں، ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں۔ آخر کار منزل کے قریب ہی بہکا دینے والا سب سے کامیاب حربہ دولت جسے وحشی سعید نے ''منی'' کا نام دیا ہے، کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آزادی کی خواہش دم توڑ دیتی ہے لیکن اس کا تصور آئینہ

دکھاتا رہتا ہے کہ رضو کی کاوشیں ابھی تک طفل مکتب ہیں اور ان کی وقعت اتنی ہی ہے جو افسانے کی اختتامی جملے سے ظاہر ہے کہ:

''رضو.....ذرا بازار سے کچے آم لا!!!!''

یعنی ابھی عقل وشعور نے اتنی ترقی بھی نہیں کی ہے کہ پکے ہوئے آم لانے کے قابل ہوئے ہوں۔ وحشی سعید نے اس افسانے میں ایک حساس ذہن جو تخلیق کار بھی ہوسکتا ہے، قومی رہنما بھی اور کسی ملک کا حکمراں بھی، کو ثابت قدم رہنے کے لئے کتنی داخلی اذیتوں جن میں حرص وہوس، مفاد پرستی، ظلم وناانصافی کے فوری سیاسی فائدے وغیرہ شامل ہیں، کو عبور کرنا ہوتا ہے لیکن اس سنگ لاخ راہ کی مشکلوں، دہشتوں اور وحشتوں کو عبور کرنے کی تاب نہ لاکر اکثر منزل کو ہی بدل دینے کا ارادہ کرتا ہے۔

''اب تو میں نے اپنے ارادوں میں سنگ کی مضبوطی بخش دی۔ میں فری کے بنے ہوئے جال سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ یہ میری جرأت کی انتہا تھی۔''

لیکن یہ عمل مزید اذیت ناک ہے۔ ''فری''، یعنی آزادی کے اتنے قریب آکر واپسی کے عمل میں جو مراحل اور ذہنی انتشار ہیں، وہ مزید کرب کا باعث ہیں۔ اس دوہری اذیت اور دوہرے کرب کے بیان میں وحشی سعید نے جن مکالموں سے کام لیا ہے اس کا علامتی پہلو بہت مستحکم ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ جدید افسانوں کی فہرست میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ''منی'' یہاں حاصل ہونے والی اس دولت وعشرت کا استعارہ بن جاتی ہے جس کے حصول کے بعد بھی اس دوہری اذیت سے فرار ممکن نہیں۔ وہ مکالمہ یہ ہے:

''حقیقت نگاری کے ایسے نادر نمونے بہت کم ملتے ہیں.....!''

میں نے پاس آکر کہا:

''لیکن ایسے لمحے کو قید کرنے کے لیے بہت لمبا سفر طے کر کے آیا ہوں۔''

''تھک گئے ہو کیا؟''

''تھک گیا ہوں.....لیکن ایک نئی امنگ کی تلاش میں ہوں۔''

جانے کیوں پہلی بار میں الفاظ پر گرفت نہیں پا رہا تھا.....جیسے کچھ کہتے کہتے کچھ اور کہہ جاتا.....بس میں تو صرف پکارتا رہا.....

''منی!.....منی.....!!''

میں خود سوچتا رہا۔ اور خود ہی اپنی سوچ کو ترتیب دیتا رہا۔ لیکن منی میری تصویروں میں خود کو چھپاتی رہی۔

اس دن اس نے ڈوبتے ہوئے سورج کی منظر کشی کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا ہر پہلو لا جواب ہے..... حضور! میں آپ کے فن کے ہر پہلو سے بہت متاثر ہوئی ہوں.....مجھ ناچیز کی طرف سے یہ تحفہ قبول کیجیے۔''

میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ میں صندل کا عصا تھما دیا۔ پھر وہ فری جس کو منوں مٹی کے نیچے سلا کے آیا تھا.....میرے کانوں میں آ کر کہنے لگی:

''رضو.....ذرا بازار سے کچے آم لا!!!!''

بڑا دروازہ

بڑی حویلی میں رہنے والے سب کے سب افراد لوہے کے پتلے تھے۔ بڑی حویلی کا صدر دروازہ کسی پرانے قلعے سے اٹھا کے کوٹھی میں نصب کیا گیا تھا۔ اس مضبوط قد آور دروازے نے نہ جانے کتنی توپوں کا بارود اپنے سینے میں دبا کے رکھا ہے۔ پچھلی دو دہائی سے اس حویلی کا دروازہ نہیں کھلا۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ حویلی کا دروازہ جب بھی کھلا..... دروازے میں دبے ہوئے بارود کے پھٹ جانے کے امکانات پیدا ہوئے۔

حویلی کے مکین کب جاگتے تھے، کب سوتے تھے، کب روتے تھے کب ہنستے تھے! کب کھانستے تھے، اس بارے میں کوئی بھی کوئی حساب نہ رکھ پایا۔ جب کبوتر بڑی حویلی کی چھت سے اڑان لے کے بادلوں کے جھرمٹ کے پیچھے بھاگنے لگتا تو کہنے والے کہتے کہ حویلی کو سورج کی کرنوں نے چھو لیا۔

اس حویلی کے بارعب شخصیت جو ادھیڑ عمر تھے، عرف عام میں بڑی حویلی کے مالک تھے..... صندل کی بنی ہوئی عصا کو تارکول کی سڑک پر ٹیکتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سفید رنگ کا کتا حویلی کے صدر دروازہ کے پاس بیٹھ جاتا، اور وہ ہر راہ گر کو تجسس کی نگاہوں سے دیکھتا۔

حویلی کی زندگی شروع ہونے کی بس یہی ایک شہادت موجود تھی۔ بوڑھا جب بہت رات گئے اپنے صندل کے عصا کو ٹیکتے ہوئے حویلی کے اندر چلا جاتا تو بلی کی میاؤں میاؤں کی آواز آتی۔ یہ آواز کسی سنسان ویران مسکن میں بسی ہوئی بدروح کی آواز لگتی تھی!

اس دن سورج نے اپنے آپ کو بادلوں میں چھپا لیا۔ پھر کچھ ہی وقت میں بادلوں نے بھی اشک ریزی شروع کی۔ یوں تو نہ جانے کتنی بار سورج نے بادلوں میں خود کو چھپا لینے کا آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا.... لیکن اس دن آسمان افسردہ تھا۔ آسمان اور افسردہ.....!

دو دہائی کے اختتام پر بڑی حویلی کا دروازہ کھل گیا!!!

حویلی کے مشرقی دروازے پر ٹنگی ہوئی تصویر میں تابوت میں کسی کی میت کو آدمیوں

کی ایک بڑی تعداد لے کے جارہی تھی.....ان آدمیوں میں میں بھی تھا!

''یا اللہ...... یہاں میں کیسے! میں نے چونکتے ہوئے انداز میں اپنے آپ کو جگانے کی کوشش کی.....لیکن وہاں بوندا باندی ہورہی تھی.....

آدمیوں کے اس قافلے میں.....میں کیا صرف اکیلا انسان تھا یا کوئی اور بھی تھا.....

وہ.....صندل کا عصا کہاں تھا؟ اب وہ بارعب شخصیت کہاں جا کر دفن ہوگئی.....آج وہ قدرے جھک گیا۔ کمر میں خم، آنکھوں میں سفیدی آگئی تھی!

آدمیوں کے اس قافلے میں صرف وہی آواز کیوں میرے کانوں میں پہنچی:

''ایک زمانہ تھا جب ان کی آواز زمانہ کی جان تھی۔ کیا آواز پائی تھی۔ آواز میں کیا لوچ تھا۔ کبھی سنا ہے ان کا گانا!''

جامع مسجد آگئی.....جنازہ کی نماز شروع ہوئی۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر........

جب ہم اس کو منوں مٹی کے نیچے سلا کے آئے تو میرا پاؤں کیچڑ میں پھنس گیا۔ میں نے پاس والی درگاہ شریف میں قبر میں سوئی ہوئی روح کے ساتھ لوہے کے پنجرے کے پاس کھڑے ہو کر تاک جھانک شروع کی۔

واپسی کا سفر بڑا کٹھن ثابت ہوا۔

میں نے بوڑھے سے کہا.....

''تھک گئے ہوں گے آپ!''

''سلمٰی.....نیلوفر.....اندر ہیں۔''

آٹھ سال کی نیلوفر نے سلمٰی سے کہا۔

''باجی.....! امی کہاں گئیں؟''

بوڑھی آپا نے سلمٰی کے آنسوؤں کو پونچھ کر نیلوفر سے کہا:

''نیلوفر!.....اب یہ تمہاری باجی نہیں امی ہے۔''

بڑی دیر تک سکوت رہا۔ حویلی کا دروازہ اس لیے نہیں کھولا گیا کہ باہر کی روشنی سے اس کے مکینوں کی آنکھیں چکا چوند نہ ہو جائیں۔ حویلی میں قد نما شیشہ بھی تھا۔ زری کے تار سے

بنا ہوا غرارہ کا سوٹ بھی تھا۔ این ایوننگ ان پیرس کی عطر بھی تھی۔ لیکن سلمٰی کے بالوں میں چاندی آ گئی تھی..... آنکھیں روتے روتے اندھی ہو گئی تھیں..... آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں.....!

اب کس کا انتظار تھا..... تصویر اب بھی وہیں ٹنگی ہوئی تھی جہاں پہلے تھی۔

آج پہلی بار حویلی میں میلہ لگا تھا۔ شاہی قورمہ پک رہا تھا۔ دستر خوان بچھ رہے تھے..... دوڑنے کے سوا کسی کو کچھ بھی سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

میرا! یہاں کیا کام.....؟ لیکن وہ میرا راستہ روکے ہوئے کہنے لگا:

''جانتے ہو..... نیلوفر..... سلمٰی کی بیٹی ہے۔''

... سلمٰی کی بیٹی ہے! شاہی قورمہ بٹ گیا..... دستر خوان اب اٹھایا جا رہا تھا۔ اب تو سب تھک کر چور ہو گئے تھے..... چالیسواں ہو گیا۔ لوگوں نے تلاوت خوانی کے بعد رخصت لی۔ اور اب میں.....

کتے کی ٹانگوں میں بلی نے اپنا بدن چھپا لیا۔ کبوتر دن بھر کی اڑان کے بعد بلی کے ریشمی جسم پر سو گیا۔ اب تو بڑی حویلی کا بڑا دروازہ بھی بند ہو گیا۔

تجزیہ:

وحشی سعید کا افسانہ ''بڑا دروازہ'' پورے طور پر ایسا علامتی افسانہ ہے جس میں حاضر راوی جو ایک مرکزی کردار ''میں'' بھی ہے، عہد حاضر کی تہذیب کی علامت ہے جو پرانی تہذیبوں کے حالات، ان پر نئی تہذیبوں کی یلغار اور اس کے اثرات کا چشم دید بھی ہے اور انہدام میں شامل بھی۔

بڑی حویلی اور اس میں رہنے والے افراد جو لوہے کے پتلے تھے، اپنی تہذیب کے محافظ کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حویلی کا مضبوط بڑا دروازہ جو پہلے کسی قلعے یعنی پرانی تہذیب کے عروج کے زمانے میں دربان کا کردار ادا کرتا تھا، جب وہ کمزور ہوگئی تو اس بڑی حویلی میں نسب کر دیا گیا جہاں پرانی قدروں کے نشانات باقی تھے، وہ دروازہ جو کئی نئی تہذیبوں کی مار جھیلنے سے کمزور ہونے کے باوجود اب بھی اس تہذیب کی ایک حفاظتی دیوار کی صورت ڈٹا ہے۔

پچھلی دو دہائیوں سے حویلی کا دروازہ نہیں کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نئی تہذیب جس کی یلغار دو دہائی میں بہت بڑھ گئی ہے، اس کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیا ہے۔ کیوں کہ دروازہ کھلتے ہی ان تمام نئی تہذیبوں (توپوں کے بارود) کے عناصر اس موجودہ نئی تہذیب کے ساتھ مل کر اس کے انہدام کے طویل امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔

حویلی کے باشندے باہر کی دنیا یعنی نئی تہذیب سے اس لئے انجان تھے کہ نہ اندر کا کوئی ان سے ملتا تھا اور نہ وہ اس سے مل سکتے تھے۔ جب بھی دروازہ کھلتا ایک بارعب ادھیڑ عمر شخص جو مٹی مگر مقدس جاہ و جلال والی تہذیب کی علامت ہے، شاید نئے دور سے موازنے کے لئے نکلتا تھا، اس کے ہاتھوں میں صندل کا عصا بھی تقدس کی علامت ہے جو اس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ سفید رنگ کا کتا (سفید رنگ شفافیت کی علامت ہے اور کتا وفاداری کی) بھی ایک حفاظتی آلہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو تجسس بھری نگاہوں سے باہر کے شب و روز کو دیکھتا

ہے۔ بوڑھے کا بہت رات گئے یعنی بہت کھوج بین کے بعد اس حویلی میں تنہا واپس آنا اور اس میں سے بلی کی میاؤں میاؤں جو کسی ویران اور سنسان مسکن میں بسی ہوئی بدروح کی آواز لگتی تھی، اشارہ دیتی ہے کہ زمانے کے بہاؤ سے کوئی کٹ کر رہ ہے تو اس کو ان حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ اس یلغار کو روکا نہیں جا سکتا، بڑا دروازہ قدیم تہذیب کی موت کے ساتھ ہی کھل جاتا ہے۔ ''میں'' جو یہاں نئی حسیت کا استعارہ بن جاتا ہے، پرانی قدروں کے ساتھ نئے کے انسلاک سے ایک مثبت صورت حال کا خواہش مند ہے، اسی لئے شاید اس جنازے میں وہ واحد ''انسان'' ہے۔ یہ احساس ہی اس کے کانوں میں کسی خوشحال تہذیب کے عروج کی کہانی ایک آواز کی صورت یاد دلاتا ہے جہاں کے آداب جدا تھے، اور ان کا گانا بھی تقدیس سے پر تھا نہ کہ فحاشی سے۔

''ایک زمانہ تھا جب ان کی آواز زمانہ کی جان تھی۔ کیا آواز پائی تھی۔ آواز میں کیا لوچ تھا۔ کبھی سنا ہے ان کا گانا!''

مقدس تہذیب کے جنازے کو جو ایک ''ماں'' کی طرح اپنے حامیوں کو اپنے سائے میں لئے رہتی ہے، دفن کرنے کے بعد ان حامیوں کا کیا حال ہے، اس کی جستجو میں جب ''میں'' تانک جھانک کرتا ہے تو اس کی حساسیت آنے والے وقت کا تصور کر کے مزید کرب میں مبتلا ہو جاتی ہے (واپسی کا سفر بڑا کٹھن ثابت ہوا)۔ بوڑھا جو کہ مٹ چکی تہذیب کی راکھ کی ایک چنگاری کی صورت میں محسوس ہوتا ہے، سے ''میں'' کا پوچھنا کہ آپ تھک گئے ہوں گے اور اس کا جواب دینا کہ سلمیٰ.. نیلوفر اندر ہیں، باور کراتا ہے کہ دفن تہذیب کے حامیوں کی نئی نسل بھی تیار ہے جو ایک طرح سے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ نیلوفر کا آٹھ سال کا ہونا یعنی نئی پود اور بوڑھی آپا کا سلمیٰ کے آنسوؤں کو پونچھ کر نیلوفر سے کہنا کہ ''اب یہ تمہاری باجی نہیں امی ہے'' جوان نسل کو یہ ذمہ داری سونپنے کے مترادف ہے۔ وحشی سعید نے حویلی کے اندر کا منظر نامہ ''یعنی پرانی تہذیب کے نئے دور کے حالات'' کو غائب راوی کے صیغے میں یوں بیان کیا ہے:

''بڑی دیر تک سکوت رہا۔ حویلی کا دروازہ اس لیے نہیں کھولا گیا کہ باہر کی روشنی سے اس کے مکینوں کی آنکھیں چکاچوند نہ ہو جائیں۔ حویلی میں قدنما شیشہ بھی تھا۔ زری کے تار سے

بنا ہوا غرارہ کا سوٹ بھی تھا۔ ایوننگ ان پیرس کی عطر بھی تھی۔ لیکن سلمٰی کے بالوں میں چاندی آ گئی تھی..... آنکھیں روتے روتے اندھی ہو گئی تھیں..... آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں.....!

اب کس کا انتظار تھا...... تصویر اب بھی وہیں ٹنگی ہوئی تھی جہاں پہلے تھی۔''

حویلی میں میلہ لگنے کا سبب جنازے کے چالیسویں کی رسم ہے جسمیں ''شاہی قورمہ'' باہر کے لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، حویلی کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یہ پورا منظر نامہ نئی تہذیب کی یلغار کی علامت ہے اور شاید فتح کی بھی ۔ اور ''شاہی قورمہ'' کا تقسیم ہونا جہاں چہلم کی ایک روایت کے طور پر سامنے آتا ہے وہیں نئی تہذیب کی فتح کے جشن کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ حساس ذہن کا یہاں کوئی کام نہ تھا، لیکن بوڑھا ابھی بھی زندہ تھا جس نے اس کا راستہ روک کر اسے بتایا کہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے:

''جانتے ہو......نیلوفر..... سلمٰی کی بیٹی ہے۔''

لیکن یہ جشن بھی عارضی ثابت ہوا، کیوں کہ سب لوگ تھک گئے، تلاوت خوانی کر کے واپس چلے گئے۔ یہ پورا علامتی منظر نامہ جو فضا تخلیق کرتا ہے، وہ یہ کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود نئی قدریں یا تہذیبیں پرانی قدروں یا تہذیبوں کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتیں۔ کیوں کہ بوڑھا ابھی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی صورت زندہ ہے اور بوڑھی آپا کے وجود کے ساتھ سلمٰی اور نیلوفر جیسی نوجوان اور اس سے آگے کی نسل کی روشنی اور حوصلے کی صورت اس کے ساتھ ہے۔

وحشی سعید کا یہ افسانہ اپنے موضوع کے انوکھے پن اور اس کو پیش کرنے کے اسلوب جس میں منظر مکالمہ اور تاریخی فضا بھی علامت کی صورت شامل ہے، کے سبب انفرادیت کا حامل ہے۔

سو گئے داستاں کہتے کہتے

رات کے اندھیرے میں قبرستان کے کنارے ایک تنہا جھونپڑی سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر زندگی کی واحد علامت تھی۔

وہ بھاگ رہی تھی۔ پھر اچانک اس تنہا جھونپڑی کے سامنے رک گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا سارا بدن پسینے سے تربتر تھا۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں رعشہ تھا۔ اپنے آپ کو اعتدال پر لانے کی کوشش میں وہ جھونپڑی کا دروازہ پیٹنے لگی۔

جھونپڑی کا دروازہ ایک کالے ہیبت ناک چہرے والے قد آور شخص نے کھولا۔ وہ بے تحاشہ چیخنے لگی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

کالے شخص نے اپنی بھیانک آواز میں کہا:

''کیا چاہیے؟''

وہ سہمی آواز میں بول پڑی:

''پناہ۔''

کالے نے جھونپڑی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کونے میں ایسے سکڑ کے بیٹھ گئی۔ جیسے کسی نے دیوار پر تصویر ٹانگ دی ہو۔ کالے نے اس کے سامنے ایک آدھی جلی روٹی اور چند پیاز کے ٹکڑے ڈالے۔

''کھاؤ!'' کالے نے کہا۔

اس نے اپنی شکم پری کے لیے وہ آدھی جلی روٹی اور چند پیاز کے ٹکڑے کھائے۔ پھر نیند نے حقیقت کے اظہار کو داستاں بنا دیا۔

ناچتے ناچتے جب بھی اس کے پاؤں دکھنے لگتے تب اس بوڑھے کا نحیف ہاتھ اس کے سر پر ہوتا۔ وہ مشکور نگاہوں سے بوڑھے کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہ جاتی۔

پھر ایک دن شہزادہ سلیم آ گیا۔

شہزادے نے کہا:

''انار کلی!.....تمہارے پاؤں ناچتے ناچتے زخمی ہو گئے ہیں۔ میں ان پر مرہم لگا دوں گا۔''

انار کلی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''شہزادے کہیں یہ خواب تو نہیں!''

بوڑھے نے اپنا مرجھایا ہوا چہرہ اور نحیف ہاتھ دونوں کو خاک کے اندر دفن کیا۔ وہ اچانک اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے دل کو یقین دلاتی رہی کہ اس کا شہزادہ اس کے پاس ہے۔ وقت کے چرخ نے شہزادے کے چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ اس نے جس سچائی کی علم برداری کا حلف اٹھایا تھا، اسے پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں نہ آئی..... اور بھاگتے بھاگتے قبرستان کی تنہا جھونپڑی میں پناہ گزیں ہو گئی۔

صبح کی کرنوں نے اسے جھونپڑی کے سناٹے میں واپس بلا لیا۔ اس نے کالے کو اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے دیکھا۔ تو سوال کیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ایک اور آیا......!'' اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی!''

''ابھی!'' وہ پوچھ بیٹھا۔

''ہاں ابھی!......میں.....! اس جھونپڑی کے سناٹے میں اکیلی رہ نہ پاؤں گی!''

''چلو.....''

اس نے اپنے کندھے پر ٹوکری رکھی۔ اور کالے کے پیچھے پیچھے چلی۔ قبرستان کی بے شمار قبروں کو پار کرتے ہوئے وہ ایسی جگہ ٹھہر گئے جہاں ابھی کوئی قبر نہ تھی۔ وہ پھاوڑے سے زمین کھودنے لگا۔ وہ ٹوکری سے مٹی ہٹانے لگی۔ وہ ایک لمبی چوڑی گہری لحد بن گئی۔

لحد کے تیار ہوتے ہی چار اشخاص ایک لاش کو کندھوں پر اٹھائے چلے آئے، انہوں نے لاش کو زمین پر رکھا۔ اور ان میں سے ایک نے کالے سے کہا۔

''لاش کو زمین کے حوالے کرو!''

کالے نے سر کے اشارے سے حامی بھری۔ وہ چاروں واپس چل پڑے۔ کالا لاش کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ زیرِ لب بول پڑا۔

''خوبصورت!''

لڑکی کی جھکی نگاہ کالے کے جملے کے ساتھ اس لاش کے چہرے پر پڑی، اس کے منہ سے دردناک چیخ نکل پڑی۔

''شہزادے.....!''

تجزیہ:

وحشی سعید کا افسانہ ''سو گئے داستاں کہتے کہتے'' اپنے عنوان کے اعتبار سے داستانی رنگ لئے ہوئے ہے۔ پہلی نظر میں یہ کسی ایسی فلم کی کہانی معلوم ہوتا ہے جو موضوع کے ضمن میں داستانی زمانے سے لے کر دور حاضر تک اپنی کشش برقرار رکھے ہوئے ہے۔ غائب راوی کے صیغے کے اس افسانے میں حال، ماضی اور پھر حال کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے اختتام میں کلائمکس کا ورود اسے منفرد بنا دیتا ہے۔

علامتی طور پر دیکھا جائے تو یہ افسانہ اپنے ظاہری معنی سے کہیں زیادہ معنی خیز محسوس ہوتا ہے۔ رقاصہ جسے وحشی سعید نے ''انارکلی'' کا نام دیا ہے، ماضی کے اس وقت کی علامت ہے جب شہزادہ یعنی امیر ترین نوجوان ان سے حقیقی محبت کرتا تھا اور شادی نہ کرنے کی مجبوری میں بھی ان کو ہر وہ سہولت میسر تھی جو ایک بیوی کو ہوتی ہے۔ لیکن آج کے شہزادے کا جو حال ہے وہ اس زمانے سے جدا ہے۔ ''بوڑھا'' یہاں اس تحفظ کی علامت ہے جو کمزور ہوتے ہوئے بھی اس کی حفاظت پر قادر ہے۔ لیکن شہزادے پر اسے اسی طرح اعتماد تھا جس طرح ''انارکلی'' کو ''سلیم'' پر۔ لیکن بوڑھے کے چہرے کا مرجھا جانا اور اپنے نحیف ہاتھوں سے دونوں کو خاک میں دفن کر دینا جہاں اس کی جرأت کی حد بندی کا اشارہ ہے کہ وہ ''انارکلی'' کے ارادوں کو بدل نہیں سکتا، وہیں ایک دور اندیش اور مشاہداتی ذہن کی بھی جو کہ شاید انجام سے بھی واقف ہے۔

''بوڑھے نے اپنا مرجھایا ہوا چہرہ اور نحیف ہاتھ دونوں کو خاک کے اندر دفن کیا۔ وہ اچانک اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے دل کو یقین دلاتی رہی کہ اس کا شہزادہ اس کے پاس ہے۔ وقت کے چرخ نے شہزادے کے چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ اس نے جس سچائی کی علم برداری کا حلف اٹھایا تھا، اسے پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں نہ آئی..... اور بھاگتے بھاگتے قبرستان کی تنہا جھونپڑی میں پناہ گزیں ہو گئی۔''

قبرستان، اس کے کنارے کی جھونپڑی اور اس میں رہنے والا ہیبت ناک چہرے والا قد آور شخص، یہ سب تاریخ اور روایت کے آئینے میں اپنی جو شناخت رکھتے ہیں، یہاں کے منظر

نامے میں اس سے بالکل الٹ دکھائی پڑتے ہیں۔ قبرستان جو موت کا علاقہ ہے، ''انارکلی'' کو اسی علاقے میں امان ملتی ہے۔ جھونپڑی جو اس موت کے علاقے کی نگہبانی کی علامت ہے ''انارکلی'' کی نگہبانی کرتی ہے اور اس میں رہنے والا جو قبرستان کی قبروں بمعنی قبر کے اندر سوئے مردوں کا محافظ ہے، ایک زندہ وجود کے محافظ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ افسانے کا اختتام کلائمکس کی جن سطور سے ہوتا ہے، وحشی سعید نے اس آفاقی حقیقت کی جانب ذہن کو متوجہ کیا ہے اور شاید یہی مرکزی واقعہ ہے کہ امیر غریب سب کی آخری منزل موت ہی ہے۔ وہ شہزادہ جس سے انارکلی اپنی عصمت بچارہی تھی، اس کو بھی کسی سے خود کو بچانے کی ضرورت تھی، جو وہ نہ کرسکا۔

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیشے کے محل میں رہنا خود اپنے آپ کو تیر ونشتر کا نشانہ بنانا ہوگا۔ میں نے پھر بھی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

اچانک سب ایک خواب کی کیفیت میں تبدیل ہوتا رہا۔

اب میں رات کے اندھیرے میں اپنے آپ کا تعاقب کرتا رہتا ہوں۔ اس اندھیرے میں بار بار وہ آواز سنائی دیتی ہے۔

''یہ سب ڈھونگ کس لیے؟''

''کیا مطلب؟ میں بول پڑتا۔

''سوچ....!.....انجام....''

زندگی کی جو ساعتیں میں نے سکون کے لیے وقف کی تھیں اب ان ساعتوں میں بھی میں اپنے آپ کو سوچ وفکر کے زنداں میں قید پاتا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں جب جب میری گہری نیند ٹوٹتی ہے، میری بند مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں ہوتا ہے۔ اور میں اس جزیرے پر ان کنوارے الفاظ کی شناخت کی جستجو میں لگ جاتا ہوں، جو مجھ میں جذب ہو کر بھی مجھ سے بہت دور ہے!

تجزیہ:

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' یہ عنوان بہت معنی خیز ہے۔ کنوارے الفاظ یعنی جن میں کوئی منفی تخیل، کوئی عیاری مکاری، جھوٹ فریب کا تصور نہ ہو بلکہ پاکیزگی، شفافیت اور حق پرستی وحق گوئی جس کا شعار ہو۔ ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں ایسا عملی تصور ایسے مقام پر ممکن ہے جہاں انسانوں کی آبادی نہ ہو، اور وہ مقام ایک جزیرہ ہی ہوسکتا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار ''میں'' جو خیر وشر کی دوہری علامت اس لئے ہے کہ وہ آج کے دور کا انسان ہے، جہاں زندگی کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ زمانے کی روش کا ساتھ دینا شدید مجبوری بن جاتا ہے اور ایک بار کی یہ مجبوری تمام زندگی کا لازمی جزو بن جاتی ہے۔ لیکن ندامت کا احساس ہمیشہ دل وذہن کو منتشر رکھتا ہے:

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیشے کے محل میں رہنا خود اپنے آپ کو تیر ونشتر کا نشانہ بنانا ہوگا۔ میں نے پھر بھی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

اچانک سب ایک خواب کی کیفیت میں تبدیل ہوتا رہا۔

اب میں رات کے اندھیرے میں اپنے آپ کا تعاقب کرتا رہتا ہوں۔ اس اندھیرے میں بار بار وہ آواز سنائی دیتی ہے۔''

وہ آواز کیا ہے؟ شاید وہ ضمیر کی حساس زدہ آواز ہے جو یہ باور کراتی رہتی ہے کہ ضمیر ابھی پوری طرح مردہ نہیں ہوا ہے، حقیقت اور تقدس کا احساس اب ذہن ودل کے کسی گوشے میں ''کنوارے الفاظ کے جزیرے'' کی مانند موجود ہے جو بند مٹھی میں پناہ گزیں ہے۔ یہ بند مٹھی کیا ہے؟ یہ بند مٹھی اس جزیرے کی پناہ گاہ ہے جہاں تک ان اندھیروں کی رسائی اب تک نہیں ہو پائی ہے جو کنوارے الفاظ کے وجود کو ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ خیر وشر کی اس کشمکش میں خیال کی سطح پر کنوارے الفاظ کا تصدق تو ہے لیکن عمل میں اس سے بہت دوری ہے لہذا وہ 'میں' کے اندر جذب ہو کر بھی اس سے بہت دور ہے۔

Kunware Alfaz Ka Jazeera

by Vehshi Syed

Analysis by Dr. Jawed Anwar

آخر کب تک۔۔۔؟

ارسطو کی واپسی

کاشر لعل بدخشان
وحشی سعید

میزان پبلشرز
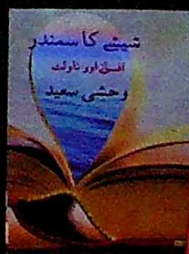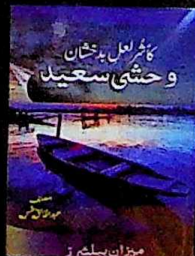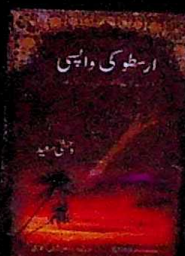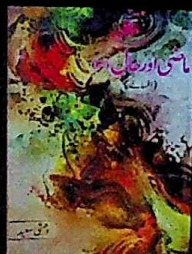
MEEZAN PUBLISHERS

OPPOSITE FIRE SERVICES HEAD QUATERS,
BATAMALOO, SRINAGAR-190009, KASHMIR.
CELL: 9419002212, 8494002212, 7006773403
email: meezanbooks2020@gmail.com, meezanpublishers@gmail.com